فصلنامہ

راہ اسلام

شمارہ : ۱۸۳-جنوری تا مارچ ۲۰۰۲ء

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلیشر

محمد حسن مظفری

خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران۔ ۱۸، تلک مارگ، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۱

فون: ۳۴-۳۳۸۳۲۳۲

فیکس: ۳۳۸۷۵۴۷

http://www.iranhouseindia.com

E-mail:mozafarihasan@yahoo.com

ادارتی ودیگر معلومات کے لئے مندرجہ ذیل پتہ پر بھی رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔

خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران ۳۳۔ مہارشی کروے روڈ (ایم۔ کے۔ روڈ) بالمقابل چرنی روڈ، ریلوے اسٹیشن۔ بمبئی

اعزازی ایڈیٹر:

ڈاکٹر اختر مہدی

همکاران مجلّه:

تزئین کار: مجید احمدی

کتابت : قاری محمد یاسین

ناشر :خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران

۱۸۔ تلک مارگ۔ نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۱

راہ اسلام میں شائع ہونے والے ہر مقالے کا اسلامی جمہوریہ ایران
کے نظریات کا مظہر ہونا لازمی نہیں۔

فہرست

	موضوعات		صفحہ
۱	اداریہ: عدل وانصاف: تمدن وبربریت کی سرحد	از: ادارہ	۴
۲	پیغام حج	از: حضرت آیت اللہ سید علی خامنہ ای	۹
۳	تصوف: احیائے دین کی روحانی تحریک	از: پروفیسر جعفر رضا	۱۶
۴	عید قربان	از: ادارہ	۷۶
۵	واقعۂ عید غدیر	از: ادارہ	۸۰
۶	ہندوستان میں فارسی زبان کی ترقی واشاعت	از: محمد حسن مظفری	۸۵
۷	اسلام دہشت گردی کا نہیں ... مذہب ہے۔	از: سید شمیم کاظم	۹۴
۸	در مدح مولائے کائنات امیر المومنینؑ	از: ایم۔ایچ۔ایم۔حسینی	۹۶
۹	ارض فلسطین	از: اشراق حمزہ پوری	۹۸
۱۰	نشتر	از: اخلاق احمد آہن	۹۹
۱۱	مذہب اسلام کی عظمت	از: ڈاکٹر اختر مہدی	۱۰۰
۱۲	ہجرت سے کامیابی تک انقلاب کی کہانی ...	از: امام خمینی	۱۰۶
۱۳	امام خمینیؒ ایک ناقابل فراموش ہستی	از: اے۔اے۔رحمانی	۱۱۴
۱۴	کربلا: درس انسانیت	از: پروفیسر شاہ وسیم	۱۱۶
۱۵	والی مصر کی بیوی زلیخا	از: ڈاکٹر نرگس جہاں	۱۲۳
۱۶	مسلمان دہشت گردی اور امریکہ	از: ضیاء الرحمٰن عاکف	۱۳۰
۱۷	انقلاب اسلامی ایران	از: ادارہ	۱۳۴
۱۸	شہید ثالث قاضی نور اللہ شوشتری	از: پروفیسر سید محمد عزیز الدین	۱۴۴

اداریہ:

عدل وانصاف

تمدن وبربریت کی سرحد

عدل وانصاف کو درحقیقت تہذیب وتمدن اور ظلم وبربریت کے درمیان ایک سرحد کی حیثیت حاصل ہے۔ اس سے وہ کیفیت مراد ہے جس کے سایہ میں انسان ہو یا حیوان، جاندار چیز ہو یا بے جان اور کوئی جماعت وگروہ ہو یا سماج ومعاشرہ ہر ایک کو اس کی استعداد وصلاحیت کے مطابق اس کا حق پہونچتا رہتا ہے۔

ایران کے ایک نامور ماہر علوم سماجیات مرحوم ڈاکٹر علی شریعتی کا خیال ہے کہ تاریخ بشریت میں انسانی معاشرہ میں رونما ہونے والے تمام انقلابات اور عوامی تحریکات میں تین اہم اسباب وعوامل کارفرما ہوا کرتے ہیں۔ جغرافیائی اعتبار سے دنیا کے کسی بھی علاقے میں ہو اور تاریخی اعتبار سے کسی بھی زمانے میں ہو انسان نے ان لوگوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے جن کی وجہ سے وہ درج ذیل مقاصد تک رسائی نہیں حاصل کر سکا۔

۱۔ آزادی واستقلال

۲۔ سماجی وانصاف

۳۔ معنویت وعرفانیت

اگر کسی انسان کو مذکورہ بالا حقوق میں سے کسی ایک حق سے محروم کردیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس پر ظلم کیا گیا ہے۔ ناانصافی، ظلم واستبداد اور انسان کو معنویت سے محروم کر کے اس پر مادیت کو مسلط کردینا درحقیقت ظلم وناانصافی کے مختلف رنگ وروپ ہیں اور ''انصاف پسندی'' ایسا جامع لفظ ہے جو ان تینوں اہم مقاصد کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ پس مختصر لفظوں میں کہا جاسکتا ہے

کہ انسان نے ناانصافی کے خلاف ہمیشہ احتجاج وانقلاب برپا کیا ہے۔ تمدن ومدنیت کا مطلب ہے عدل وانصاف کی پیروی کرنا اور بربریت کا مطلب ہے ظالمانہ سلوک۔ عدل وانصاف ہمیشہ باقی رہنے والے ارمان ومقصد کا نام ہے اور صدیاں گزرنے کے بعد بھی اس پر قدامت غالب نہیں ہوتی۔ ظلم سے ٹکرانے اور عدل وانصاف کی تبلیغ واشاعت کا کام انجام دینے والے دنیا کے ہر گوشے وعلاقے، قوم وقبیلے، دین ومذہب اور رنگ ونسل کے لوگوں کے درمیان لائق احترام ہوتے ہیں اور ظلم ہر دور اور قوم ونسل کے درمیان نفرت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ درحقیقت انقلابی رہنماؤں، سماجی مصلحوں اور پیغمبروں کی جاودانگی کا راز یہ ہے کہ عدل وانصاف سے ان کی شخصیت کا اٹوٹ رشتہ ہوتا ہے، وہ عدالت کے ساتھ ہم آواز وہمساز ہوتے ہیں اور ظالم واستبدادی طاقتوں کے مقابلے میں وہ کوہ ہمالیہ کی طرح اپنے موقف پر ثابت قدم رہا کرتے ہیں اور ظلم کا بڑا سے بڑا طوفان انھیں ہلا بھی نہیں سکتا۔

تاریخ اسلام کا سرسری مطالعہ کرنے سے بھی یہ حقیقت پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے کہ ظہور اسلام سے قبل دور جاہلیت میں پورے عربستان میں ظلم وناانصافی کا بازار گرم تھا معمولی سی بات پر دو عرب قبیلوں کے درمیان برسوں قتل وغارتگری کا سلسلہ جاری رہا کرتا تھا اور ظالمانہ حرکتوں کو باعث شرف وافتخار قرار دیا جاتا تھا اور اسلام سے قبل عرب سماج کے درمیان یہ نعرہ غیر معمولی مقبولیت کا حامل تھا۔ ''انصر اخاك ظالماً ومظلوماً۔'' یعنی اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ دوسری طرف اسلام شروع ہی سے عدل وانصاف کا علمبردار رہا ہے بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ عدل وانصاف اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ایک ہے۔ ظلم وبربریت کے مقابلے میں قرآن نے ہم لوگوں کو یہ ہدایت دی۔ ''یآ ایها الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط۔'' یعنی اے ایمان والو! ہمیشہ عدل وانصاف قائم کرنے میں سرگرم رہو، خداوند عالم کی رضا وخوشنودی کے لیے گواہی دو چاہے اس سے تمہارا یا تمہارے والدین اور تمہارے رشتہ داروں کا نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ پس گواہی دینے میں اپنی مرضی کی پیروی نہ کرو کیونکہ عدل وانصاف کے دائرہ سے خارج ہو جاؤ گے... خداوند عالم تمہاری نقل وحرکت سے بخوبی آگاہ ہے[1]

قرآن مجید میں دوسری جگہ ارشاد خداوندی ہوتا ہے۔

''جن لوگوں نے تمہیں مسجد الحرام سے الگ رکھا ان کی عداوت و دشمنی تمہیں اس بات کے لیے مجبور نہ کر دے کہ تم اصول و قوانین سے تجاوز کر جاؤ۔ نیک اعمال اور پرہیزگاری کے سلسلے میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔ گناہ اور ظلم کی حمایت نہ کرو فقط خدا کی پرواہ کرو کیونکہ خداوند شدید العقاب ہے[۲]

اس کے علاوہ ایک جگہ قرآن ارشاد فرماتا ہے کہ ''جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان پر بھروسہ نہ کرو۔ کیونکہ تمہارے اوپر بھی عذاب نازل ہو سکتا ہے۔[۳]

یہ سب کچھ قرآنی تعلیم و تربیت کے نمونے ہیں اور ان آیات کے بموجب مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ دشمنوں سے بھی معاملہ کرتے وقت عدل و انصاف کو ہی معیار اور کسوٹی قرار دیں۔ ذاتی، خاندانی، قومی، مذہبی اور نسلی مفاد و مصالح کے پیش نظر ان لوگوں کے ساتھ معاملہ کرتے وقت بھی عدل و انصاف کے دائرہ سے خارج نہ ہونا چاہئے۔ مسلمانوں کو اس بات کا حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ظالموں کی حمایت و طرفداری کریں۔ اس کے علاوہ انہیں ظالمین سے مدد حاصل کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ جو معاشرہ ان اصولوں اور معیاروں کی پیروی کرتا ہے وہ یقیناً ایک متمدن معاشرہ ہے۔ جو معاشرے عدل و انصاف کے لئے نہیں بلکہ فقط ملکی، قومی اور علاقائی مفاد و مصالح کو نگاہ میں رکھتے ہوئے فوجی اور سیاسی تنظیموں کی تشکیل میں ہمہ تن سرگرم رہا کرتے ہیں وہ در حقیقت متمدن معاشرہ کی فہرست میں نہیں آتے کیونکہ عدل انصاف اور تمدن کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ متمدن ہونے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان لازمی طور پر ماڈرن بھی ہو۔ ممکن ہے کہ کوئی معاشرہ بظاہر ماڈرن اور جدید نہ ہو لیکن اخلاق و کردار کے اعتبار سے عدل انصاف سے بیحد نزدیک ہو۔ عدل انصاف اور استقلال و آزادی کی تبلیغ و اشاعت کرنے والی تحریکیں چاہے ہزاروں سال پرانی ہی کیوں نہ ہوں، بہر حال ایک متمدن تحریک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ خالی ہاتھ بے گناہ لوگوں پر اندھا دھند فائرنگ اور اگنست عورتوں، مردوں اور بچوں کا وحشیانہ قتل عام چاہے کتنے ہی جدید ترین اسلحوں کے ذریعہ کیوں نہ کیا گیا ہو، بہر حال ظلم و بربریت کا مصداق ہے۔ دنیا کی کوئی بھی تنظیم یا سیاسی نظام یا متمدن انسان مجرموں اور بے گناہوں کو ایک ساتھ سزا نہیں دیتا بلکہ سزا دیتے وقت اس بات کا پورا خیال رکھتا ہے سزا اسی شخص کو دی جائے جس نے جرم کیا ہے اور جرم و سزا کے درمیان تناسب و توازن بھی قائم

رہے۔ اگر کہیں ایسا ہو کہ جرم کرنے والا کوئی اور ہو اور سزا کسی دوسرے کو دی جائے تو اس جگہ اور نظام حکومت کو اندھیر نگری اور چوپٹ راج کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

تمدن اور بربریت کے درمیان ٹکراؤ نہایت قدیمی اور طوالانی ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو دنیا میں اولاد آدم کی آمد کے ساتھ ہی دونوں کے درمیان ٹکراؤ کی صورتحال پیدا ہو گئی تھی۔ حضرت آدم کا بیٹا ھابیل اپنے بھائی قابیل کے ذریعہ نہایت بیرحمی سے قتل کر ڈالا گیا تھا۔ اپنی وحشیانہ صفت اور ظالمانہ عادت کیوجہ سے قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا۔ قتل کی دھمکی دیتے ہوئے قابیل نے اپنے بھائی سے کہا: میں تجھے قتل کر ڈالوں گا۔ عدل وانصاف کے پجاری ھابیل نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''قال لاقتلنك" اگر تم مجھے قتل کرنے کے لئے دست درازی کرتے ہو تو کرو لیکن میں تمہیں قتل کرنے کے لیے دست درازی نہیں کروں گا کیونکہ میں پروردگار عالم سے ڈرتا ہوں۔''[۴]

بربریت اور دہشت گردی کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کا عدل وانصاف سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ وہ قتل کرنا چاہتا ہے اس لیے قتل کرتا ہے! اس کی نظر میں سزا دیتے وقت انصاف کسوٹی نہیں ہے۔ یہ مجرم اور گنہگار کو تلاش کرنے کی زحمت نہیں کرتا ہے۔ یہ گنہگار اور بے گناہ، مرد وعورت اور بزرگ وخورد یا کمسن وسن رسیدہ کے درمیان کسی قسم کے فرق وامتیاز کا قائل نہیں ہے۔ بلکہ یہ سب لوگوں پر ایک ساتھ وحشیانہ حملہ کر دیتا ہے۔ اسکی نظر میں مد مقابل مجرم ومحکوم ہے اور اس کو مجرم ثابت کرنے کے لیے کسی عدالت، قاضی اور دفاع کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

کربلا کا دردانگیز واقعہ، حسین مظلوم اور ان کے اصحاب وانصار واقربا کی شہادت اور خواتین وکمسن بچوں پر مشتمل اہلبیت کی اسیری وگرفتاری درحقیقت اموی نظام حکومت کی بربریت کی واضح دلیل ہے۔ روز عاشورہ صبح سے لیکر ظہر تک کئی ہزار مسلح اور بھیڑیا صفت لڑاکو فوجی کچھ مظلوموں کو ان کی عورتوں اور ان کے بچوں کے سامنے قتل کرنے کے لیے ان لوگوں پر ٹوٹ پڑے اور حسین مظلوم کی آغوش میں انکے شیر خوار بچے کو بھی نہایت بیرحمی کے ساتھ شہید کر ڈالا۔

آج بھی فلسطینی مظلوم، خواتین اور شیر خوار بچے جدید ترین اسلحوں سے مسلح صہیونی جلادوں کے ذریعہ کی جانے والی بمباری کے دوران بیرحمانہ انداز میں قتل کیے جا رہے ہیں۔ ان

مظلوموں کے آبائی وطن پر ان نسل پرست جلادوں نے گذشتہ کئی دہائیوں سے اپنا قبضہ جمار کھا ہے اور خالی ہاتھ فلسطینی مظلوموں پر مسلسل بمباری کا سلسلہ جاری ہے۔ گذشتہ نصف صدی سے ان مظلوموں پر مظالم کی بھر مار ہے لیکن گذشتہ چند روز کے دوران ان پر جو مظالم کیے گئے ہیں وہ پچاس سال کے دوران کیے گئے مظالم سے کئی گنا زیادہ ہیں۔ در حقیقت صہیونی حکومت جدید ترین دہشت گردی کی بہترین مصداق ہے کیونکہ یہ مرد عورت اور بے گناہ بوڑھوں اور بچوں پر ایک ساتھ ہوائی بمباری اور زمینی گولی باری کے دوران ہزاروں بے گناہوں کو قتل کر دینے میں ذرہ برابر ہچکچاہٹ نہیں محسوس کرتی ہے۔

لیکن مالک و خالق کائنات نیز سالم انسانی روح بربریت کو پسند نہیں کرتی ہے اور آخر کار ہر ظالمانہ فکر اور بربریت پر مشتمل نظام کا انجام بہر حال فنا و نابودی ہے اور پاک و پاکیزہ نیز بے چین انسانی روح عدل و انصاف اور معیاری انسانی تمدن کی ترویج و بالادستی کے انتظار میں ہے۔

"وسیعلم الّذین ظلموا ایَ منقلب یَنقلبون۔"۵

حواله:

۱۔سوره نساء آیت ۱۳۵

۲۔ سوره مائده آیت۔۲

۳۔ سوره هود آیت ۱۱۳

۴۔سوره مائده آیت ۲۸

۵۔الشعراء آیت ۲۲۷

حجاج بیت اللہ الحرام کے نام اسلامی انقلاب کے قائد عظیم الشان

آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای

کا پیغام

حج بیت اللہ وہ عظیم الٰہی فریضہ ہے جو اسلامی دنیا کے مرکز یعنی مکہ معظمہ کی مقدس سرزمین پر ہر سال ماہ ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو بڑی شان وشوکت کے ساتھ انجام دیا جاتا ہے۔ دنیا کے دورافتادہ علاقوں میں بھی زندگی بسر کرنے والے صاحب استطاعت مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اس عظیم روحانی و مقدس اجتماع میں شریک ہوں اور لبیک اللّھم لبیک کانعرہ بلند کرتے ہوئے اپنے مالک وخالق کی بارگاہ میں یہ اعلان کریں کہ مالک! تونے طلب کیا تو ہم تیری بارگاہ میں حاضر ہیں۔ ہماری اس حاضری کا بنیادی مقصد سنت ابراہیمیؑ کی پیروی کرتے ہوئے تیری رضا وخوشنودی حاصل کرنا ہے۔

ملت اسلامیہ عالم کے اس عظیم عالمی وروحانی اجتماع میں شریک دنیا کے لاکھوں مسلمانوں کے نام رہبر انقلاب اسلامی آیت اللہ سید علی خامنہ ای نے امسال جو پیغام حج جاری کیا ہے اس کا اردو ترجمہ قارئین فصلنامہ" راہ اسلام " کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

والحمد للّٰہ رب العالمین والصّلوۃ علیٰ سید البریۃ محمد وآلہ الطاھرین وعلی صحبہ المخلصین والسّلام علیٰ عباد اللّٰہ الصالحین۔

خداوند عالم کا ارشاد گرامی ہے: انّ ھذہ امّتکم امّۃ واحدۃ وانا ربّکم فاعبدون۔

حج بیت اللہ کا دلکش وروحانی اور دینی وعرفانی منظر ایک بار پھر ہماری نگاہوں کے سامنے موجود ہے۔ یہ مقدس سفر دنیا کے تمام مسلمانوں کی دلی تمنااوران تمام لوگوں کے لیے حق وصداقت اور بہشت کا راستہ ہے جواس پر گامزن رہنے کے متمنی ہیں۔ امسال پھر دنیا کے مختلف علاقوں میں زندگی بسر کرنے والے صالح بندگان خداکو مسلمانوں کے اس مقدس الٰہی اجتماع میں شرکت کا شرف حاصل ہو گیا ہے۔ عبادت وبندگی کی نورانی فضا میں پوری طرح غرق ہو جانا، صدر اسلام کی یادوں کو تازہ رکھنا اور عزت وعظمت نیز فلاح وبہبود کی ان علامتوں کی جستجو میں ہمہ تن سرگرم رہنا، جس نے زمین کے اس خطے کو تاریخ کے بلند آسمانوں میں ایک تابناک خورشید کی طرح درخشاں بنادیا ہے۔ یہ حق وہدایت کے تشنہ مگر ہوشیار مسافر کے قلب وذہن کو حاصل ہونے والے ابتدائی فضائل وکمالات ہیں۔

یہ وہ عظیم ومقدس مقام ہے جہاں وقتی طور پر ہی سہی مگر ہر قسم کے مادی تعلقات، آلودگیوں غفلتوں نیز لباس وزیورات کی ٹزک بھڑک سے انسان کا رابطہ منقطع ہو جاتا ہے اور احرام کا سفید کپڑا پاکیزگی وطہارت ویکسانیت کوان لوگوں کے دلوں پر غالب کر دیتا ہے اور دیکھنے، سننے اور سمجھنے کا وہ راستہ صاف دکھائی دینے لگتا ہے جو ابدی نجات حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ علم ومعرفت اور اسلامی اخوت وبرادری کے شگوفے کھل جاتے ہیں اور الٰہی ہدایت ورہنمائی کا جلوہ نمایاں ہو جاتا ہے۔

یہ امت اسلامیہ کا عظیم اجتماع ہے "یہ خداپرست" اور "عوام پسند" ہونے کی تجربہ گاہ ہے۔ یہی وہ مقدس جگہ ہے جہاں انسان خود پرستی کے جھوٹے اور شرک آلود مظاہرہ سے علحدگی اختیار کرتے ہوئے الٰہی اور حقیقی ذات سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ یہ طاغوتیت، آمریت اور شیطانیت سے برأت وبیزاری اختیار کرتے ہوئے لشکر رحمان سے وابستہ ہونے کی جگہ ہے۔ "ان لاتعبدوا الشّیطان" کو عملی جامہ پہنانے اور "انّ اللّٰہ بری مّن المشرکین ورسولہ .کا عملی جواب فراہم کرنے کی جگہ ہے۔ یہ امت واحدہ اسلامی کی جلوہ نمائی اور مسلمانوں کی انسانی طاقت ومعنوی عزت کے مظاہرہ کی جگہ ہے۔

آج پیغمبر رحمت کی آواز ہمیشہ سے زیادہ واضح لفظوں میں سنائی دے رہی ہے۔ دعوت اسلامی کی آواز، درحقیقت عدالت، آزادی اور نجات کی طرف دعوت ہے، آج زیادہ زوردار انداز میں

سنائی دے رہی ہے۔ ایک طرف خود غرضی، ظلم اور آنسوؤں سے چھلکتی ہوئی کالی رات کے ٹکڑے ہیں اور دوسری طرف جہالت، خرافات ار مکر و فریب کی فراوانی ہے۔ ایسے گھٹن کے ماحول میں انسان پہلے سے کہیں زیادہ نجات کی روشنی کا محتاج اور عدل و انصاف، صلح سلامتی اوراخوت و برادری کا پیاسا ہے۔ آج "تعالوا الٰهی کلمة سواء بیننا وبینکم الاتعبدوا الا الله ۔" کی ملکوتی آواز درحقیقت دولت اور طاقت کے خداؤں کی اعلانیہ تردید اور ظلم کے خلاف صف آرائی کا درجہ رکھتی اور یہ آواز اسیروں اور مظلوموں کو زیادہ اچھی لگتی ہے اور" انّ الله علیٰ نصرهم لقدیر "کی خوشخبری ان لوگوں کو خوشی اور امید سے مالا مال بنادیتی ہے۔

یہی لوگ درحقیقت ان الہامات اور الٰہی پیغامات کے پہلے مخاطب و مصداق ہیں۔ اسلامی بیداری نے دنیائے اسلام کے مشرقی اور مغربی علاقوں میں غیر معمولی جوش پیدا کردیا ہے اور ان لوگوں میں اسلامی شناخت و شخصیت کا احساس دوبارہ پیدا ہو گیا ہے۔ سرزمین ایران میں اسلامی پرچم لہرارہا ہے۔ اسلامی تعلیمات و تمسک کے ذریعہ مظلوم فلسطینی عوام نے صہیونیت کے اونچے منصوبوں کو مایوسی اور نا امیدی میں تبدیل کردیا ہے اسلامی ممالک میں ہمارے نوجوان بچے میدان جنگ میں داخل ہو چکے ہیں اور طاغوتی اور غاصبانہ طاقتوں کے خلاف اپنی مسلسل جدوجہد کے ذریعہ انھیں اپنے اسلامی ارمانات کو پورا کرنا ہے اور یہ لوگ عالمی استکباری طاقتوں کے خلاف ایک بڑا خطرہ پیدا کر چکے ہیں۔

آج صیہونی اور سامراجی تبلیغی مراکز کی جانب سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف الزامات اور بے بنیاد پروپگنڈوں کا سیلاب سا امنڈا ہوا ہے اور اس کا سب سے بڑا نشانہ اسلام کے بہادر اور جانباز فداکار ہیں جن کی لگاتار جہد و جہد کے نتیجے میں اسلام اور مسلمان مجاہدین کے خلاف عالمگیر پروپگنڈوں کے باوجود ہمارے پیغمبر عظیم الشان کے خالص اسلامی و محمدی افکار و عقائد سے ساری دنیا واقف ہو چکی ہے اور حقیقی اسلام کا چہرہ دنیاوالوں کے سامنے آہستہ آہستہ صاف ہو تا چلا جارہا ہے اور دھیرے دھیرے ساری دنیا کو اس حقیقت کا بخوبی علم ہو جائے گا کہ اسلام انصاف و آزادی اور نجات و رستگاری کا مذہب ہے اور اس مذہب میں فکر و دانش اور عقل و منطق کو نمایاں حیثیت واہمیت حاصل ہے۔

اسلام مذہب زندگی ہے جو عزت، احترام اور آزادی سے محروم زندگی کو موت سے تعبیر

کرتا ہے۔ اسلام منطق و عقلانیت کا مذہب ہے لیکن اس نے تعلقات سے وابستہ ان گمراہ کن خیالات کی شدید مخالفت و تردید کی ہے جس کے پیرو خدا کے پیغمبروں کو مجنون کہا کرتے تھے۔ اسلام اتحاد، برادری اور عالمی صلح کا مذہب ہے لیکن ان ظالموں کے ساتھ مظلوموں کے اتحاد کی سخت تردید و ممانعت کرتا ہے جو مسلمانوں کے خلاف خیانت کرتے ہوئے مظلوموں کے جنازہ کے پاس کھڑا ہو کر نہایت گرمجوشی کے ساتھ ظالم سے ہاتھ ملاتے نے میں قطعاً تکلف نہیں کرتے۔ اسلام حقیقت پسندی اور احساس ذمہ داری پر مبنی مذہب ہے لیکن حقیقت پسندی کے نام پر ظلم و بربریت کو ہرگز برداشت نہیں کرتا ہے بلکہ اس کو گناہ سے تعبیر کرتا۔ اسلام ہمیشہ باقی رہنے والے اصول و احکام کا مذہب ہے لیکن یہ متعصبانہ، متشبدانہ اور غیر استدلانہ اصولوں کی اعلانیہ تردید بھی کرتا ہے۔ اسلام اجتہاد و ایجاد اور نو آوری و نو فکری کا دین ہے لیکن یہ بدعت و انحراف آمیز دینی افکار کی تردید کرتا ہے۔ اسلام عفو و معافی اور اغماض چشم پوشی کا مذہب ہے لیکن یہ ظلم وذلت کو تحمل کرنے کی اجازت نہیں دیتا ہے اسلام معیاری تہذیب و تمدن، علم و دانش اور ترقی و خوشحالی کا مذہب ہے لیکن اس علم کو مکمل جہالت و بربریت سے تعبیر کرتا ہے جس کے ذریعہ انسان کی تمدنی نابودی و غارتگری اور ذات بنی نوع انسانی کی ذلت ورسوائی کا سامان فراہم کیا جائے۔ اسلام دین جہاد تو ہے لیکن غیر منطقی اور غاصبانہ جنگوں کو کبھی جہاد نہیں تسلیم کرتا ہے۔ اسلام عزت، طاقت اور حاکمیت کا مذہب لیکن مذہب کو نامعقول اور غیر شریفانہ وسائل کی توجیہ کا باعث نہیں قرار دیتا ہے۔

اسلام انسانوں کی حرمت اور ان کے حقوق کا محافظ ہے، یہ اخلاق اور فضیلت کی ضمانت فراہم کرتا ہے اور صلح و سلامتی کی آواز بلند کرتا ہے۔ درحقیقت وہ لوگ بدترین جھوٹ اور بزدلانہ ترین الزامات کے مرتکب ہیں جو مذہب اسلام کو انسانی حقوق، معیاری تہذیب و تمدن اور صلح سلامتی کا مخالف قرار دیتے ہیں اور اس ہتھکنڈوں کا استعمال کرتے ہوئے وہ مسلم قوموں کے خلاف اپنی جلادانہ کرتوتوں کی توجیہ کرنا چاہتے ہیں۔

مسلمان اقوام، علمای دین، روشن فکران نام آور اور دنیای اسلام کے غیرت مند دانشور اور نوجوانو! سر دست ملت اسلامیہ مختلف النوع دھمکیوں اور اہانتوں کا نشانہ بنی ہوئی ہے اور مطلق العنان

عالمی سامراج امریکی حکومت کی سربراہی اور صہیونی حکومت کی دلالی و آتش افروزی کے سایہ میں ایک طرف تو امت اسلامیہ کے درمیان اختلافات سے بھرپور فائدہ اٹھارہا ہے۔ ملت اسلامیہ فلسطین کے معرکۃ الآراء کتاب اور انتفاضہ کے عظیم الشان پرچم نے علامی سامراج کے سیاسی ماہرین کو غضبناک اور دہشت زدہ کرر کھا ہے اور وہ لوگ پاگلوں کی طرح اپنی طاقت کی نمائش کی خاطر فلسطینی مظلوموں پر اندھادھند بمباری اور وحشیانہ سرگرمیوں میں لگے ہوئے ہیں۔

۱۱ر ستمبر کو نیویارک میں رونما ہونے والے حوادث کی وجہ سے امریکی حکومت کو اپنی طاقت کی نمائش کا بہترین بہانہ حاصل ہوگیا ہے۔ چنانچہ وہائٹ ہاؤس کی حمایت و حوصلہ افزائی کے سایہ میں صہیونی حکومت نے فلسطینیوں پر کیے جانے والے مظالم میں کئی گنا اضافہ کردیا ہے۔ افغانستان پر امریکہ کی وحشیانہ بمباری نے امریکی حکومت کے شدت پسند فوجی چہرے سے نقاب الٹ دی ہے اور یہ انسانیت سوز حوادث روز بروز عالمی فضا کو جنگ، ناامنی، عدم سلامتی اور قتل و غارتگری کی طرف لیے جارہے ہیں۔ دہشت گردی کے خلاف جدوجہد اور مشرق وسطیٰ میں صلح کا دفاع وغیرہ در حقیقت امریکہ کے وسعت پسندانہ منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کا بہانہ ہیں تاکہ امریکہ دیگر اقوام عالم کے مالی ذخائر پر اپنا ناجائز قبضہ جمائے رکھ سکے۔

اس سے بڑی شرمناک بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ ایک ایسا ملک جو عرصۂ دراز سے دہشت گردی کی حمایت و پشت پناہی میں سرگرم رہا ہے، ایک ایسا ملک جو دنیا کے دیگر ملکوں میں فوجی بغاوتوں کا منصوبہ بناکر ان منصوبوں کو عملی جامہ پہناتا چلا آرہا ہے، ایک ایسا ملک جس کے پاس عمومی ہلاکت و تباہی پھیلانے والے اسلحوں کا بڑا ذخیرہ موجود ہے اور ایک ایسا ملک جو دنیا کے خطرناک دہشت گردوں کی حمایت کرتا چلا آرہا ہے، وہ دہشت گردی کے خلاف عالمی سطح پر لڑی جانے والی جنگ کی قیادت کا مدعی ہے۔ یہ بات حقیقت کے بالکل برعکس ہے کہ فلسطینی مرد و عورت اور بچوں کا قتل عام، فلسطینی مظلوموں کے گھروں کی مکمل تباہی و بربادی، ان لوگوں کو ان کے آبائی وطن سے آوارہ و دربدر کرنا صلح کی حمایت و حفاظت ہے۔ آخر ان ظالمانہ کرتوتوں کو صلح کا نام کیسے دیا جاسکتا ہے۔

وہائٹ ہاؤس کے حکمراں ہمارے اسلامی ملک پر یہ الزام عائد کررہے ہیں کہ وہ مشرق وسطیٰ

میں صلح و سلامتی کے سلسلے میں رکاوٹیں پیدا کر رہا ہے۔ یہ لوگ اس حقیقت سے آج بھی غافل ہیں کہ ملت فلسطین کے جائز حقوق کی تردید و خلاف ورزی اور فلسطینی عوام کے وطن پر غاصبانہ تسلط کو صلح کا نام کبھی نہیں دیا جا سکتا ہے اس ظالمانہ منصوبہ کی ناکامی کے لیے کسی قسم کی مداخلت کی چنداں ضرورت نہیں ہے بلکہ اس ظالمانہ روش کی شکست و ناکامی یقینی ہے اور آج فلسطینی عوام کے درمیان پائی جانے والی بیداری و فداکاری اس روش کی ناکامی کی ناقابل تردید علامتیں ہیں۔

اسلامی جمہوریۂ ایران نے نجات و آزادی اور اعلیٰ تعلیمات و روشن فکری پر مشتمل دین مبین اسلام کے پرچم کو مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے اور قدرت و اقتدار کے دعویداروں کی دھمکیوں کہ وجہ سے وہ اس پرچم سے دستبرداری اختیار کرنے والا نہیں ہے۔ اسلامی تعلیمات پر قائم ایران دہشت گردی کو انسانی سعادت و خوشحالی کا دشمن مانتا ہے اور امریکہ و اسرائیل کی آغوش تربیت میں پروردہ دہشت گردوں کے خلاف اپنی جدوجہد کے دوران بھاری قیمت ادا کر چکا ہے۔ پس اسلامی جمہوریۂ ایران سامراجی طاقت، دھمکی اور خطرناک چہرے سے مرعوب و خوفزدہ ہونے والا نہیں ہے۔ ہماری حکومت اور ہمارے عوام اپنے قائد عظیم الشان امام خمینیؒ کی عہد آفریں تعلیم و تربیت کے سایہ میں اپنے آزاد و عاقلانہ و شجاعانہ موقف کی قدر و قیمت سے بخوبی واقف اور اس کا بھرپور دفاع کرتے ہیں اور امسال ۲۲ر بہمن یعنی انقلاب اسلامی ایران کی سالگرہ کے موقع پر اپنے ملک گیر اور عظیم الشان مظاہروں کے ذریعہ ان لوگوں کے بے بنیاد الزامات اور دعووں کا محکم و دندان شکن جواب دے چکے ہیں جو اسلامی حکومت اور عوام کے درمیان اختلافات کا بیج بونے میں سرگرم ہیں۔ ایرانی حکومت اور عوام دھمکیوں اور جنگ افروز سرگرمیوں پر مشتمل امریکی سیاست کی اعلانیہ اور بھرپور مذمت کرتے ہیں کیونکہ اس سے امریکہ کی وحشیانہ اور جارحانہ فطرت کی نشاندہی ہوتی ہے اور امریکی حکمرانوں کے کا جارحانہ اخلاق اور غیر منطقی رویہ سے اس ظالمانہ نظام قدرت کی کمزور اور غیر محفوظ بنیادوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔

ایرانی حکومت اور عوام دنیا کی تمام مسلمان قوموں کو اتحاد کی دعوت دیتے ہیں۔ ہم اپنی اسلامی اخوت و برادری کو اور زیادہ مستحکم بنانے کے لیے دنیا کے تمام اسلامی ملکوں کی طرف تعاون و

دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں اسلامی دنیا کے تمام مسلم علماء، ودانشور اور ماہرین سیاست پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے عوام کے درمیان اتحاد، مقابلہ ومقاومت اور اسلامی بیداری کے درس کو بار بار دہراتے رہیں اور امت اسلامیہ کے ابھرتے ہوئے نوجوانوں کو بڑے حوادث کو جھیلنے اور بھاری امانتوں کے بوجھ کو اپنے کندھوں پر اٹھانے اور دنیا میں ایک متحد اور طاقتور امت اسلامیہ کی تشکیل کی راہ میں ہمہ تن سرگرم رہیں۔

حج اس عظیم ومبارک جدوجہد کے لیے ایک نقطۂ آغاز اور وسیلہ لامتناہی کی حیثیت رکھتا ہے۔

بارگاہ عالیہ خداوندی میں دست بدعا ہوں کہ وہ آپ سبھی لوگوں کو معنویت ومعرفت کے ذخیرہ سے پوری طرح مالامال ہو کر اپنے وطن واپسی کی توفیق عطا فرمائے اور امت اسلامیہ عالم کو حضرت ولی اللہ لاعظم کی دعاؤں کا مصداق قرار فرمائے۔

والسلام علیکم ورحمة الله وبرکاته

سید علی خامنہ ای

۵/ذی الحجہ ۱۴۲۲ھ

تصوف : احیائے دین کی روحانی تحریک

(سریال۔۲)

❑ پروفیسر سید جعفر رضا

نظریاتی مسائل و مباحث

زیر نظر مقالہ کا سریال۱ گذشتہ شمارہ میں شائع ہو کر انتہائی مقبول ہوا اور ادبی حلقوں کے علاوہ مذہبی و روحانی حلقوں میں بھی اس کی غیر معمولی پذیرائی ہوئی ہے۔ جس کے لیے ہمیں مسلسل ستائشی خطوط موصول ہو رہے ہیں۔ ہمیں مسرّت وافتخار ہے کہ ادارہ کو پروفیسر سید جعفر رضا کا تعاون حاصل ہے۔ پروفیسر سید جعفر رضا بین الاقوامی شہرت وعظمت کے حامل ان معدودے چند ادیبوں اور دانش وروں میں ہیں جن کے علم وفضل کے متعدد ومتنوع جہات ہیں۔ موصوف بیک وقت کئی زبانوں کے ماہر ومصنف ہیں۔ اسلامیات سے متعلق ان کے علمی کارناموں کے اعتراف میں اسلامی جمہوری ایران نے نویں اندیشہ' اسلامی عالمی کانفرنس ۱۹۹۲ء (تہران) کے موقع پر انہیں خصوصی تمغۂ طلائی سے مزین کیا تھا۔ (ادارہ)

تصوف کو علم کا درجہ حاصل ہے۔ اس کے علمی ارتقا کی مختلف منزلیں ہیں لیکن دیگر اسلامی علوم کی طرح ہی تصوف کو اکثر و بیشتر یورپی حکماء کی توضیحات کی روشنی میں سمجھا جاتا رہا ہے جو بڑے زور و شور سے باور کراتے رہتے ہیں کہ انسانی علوم کے متعلق اسلام بڑی حد تک نظری (Theoretical) اور داخلی (Subjective) نظریات تک محدود ہے۔ اس میں تجربی (Empirical) عوامل شامل نہیں ہیں حالانکہ سچ یہ ہے کہ مغرب کا نظریۂ عملی Pragmation جو کوری مادیت پر قائم ہے، بذاتہ انتہائی محدود و جامد ہے، جبکہ اسلامی علم و حکمت کا

دائرۂ عمل لامحدود و بیکراں ہے، جس میں مادیت کے راحت افزا نتائج کے علاوہ روحانی و دینی فلاح کے عناصر شامل ہیں۔اے کاش، ان توفیقِ الٰہی سے محروموں کو یک رخے متعصبانہ رویے سے نجات ملتی، اُن کی نگاہیں اس حقیقت کی جانب بھی اُٹھتیں کہ یہ اسلامی علوم کا اثباتی و مشاہداتی رجحان ہی تھا، جس نے یورپ میں ازمنہ مظلمہ کے خالص داخلی تصورِ علم کے بعد ہی ذوقِ مشاہدہ اور شوقِ تجربہ پیدا کیا۔اسلامی علوم کی بدولت یورپ کو علمی روشنی حاصل ہوئی۔اور یہ یورپ کی بدنصیبی ہے کہ کہ وہ علمِ وہبی کا قائل نہیں ہے۔حالانکہ تمام تر انسانی علم بدلیتِ ربانی کا فیض ہے کیونکہ حیاتِ انسانی ہی فیضِ ربانی کی دلیل ہے۔

تصوف اسلامی علوم میں اس خصوصیت کی بنا پر امتیاز کا حامل ہے کہ اس میں بیک وقت نظری اور داخلی نظریات کے پہلو بہ پہلو تجربی عوامل شامل ہیں۔عصر حاضر کی اہم ترین کتابوں میں علامہ محمد اقبال کی دو عہد آفریں تصانیف The Development of Metaphysics in Persia اور Reconstruction of Religious Thoughts in Islam اہم ہیں۔ پہلی کتاب ان کا تحقیقی مقالہ ہے۔اس کی عصری معنویت کے متعلق خود علامہ اقبال کا خیال ہے: کہ ''اب اس کتاب کا صرف تھوڑا سا حصہ باقی ہے جو تنقید سے بچ سکے۔'' ہمارے نزدیک یہ 'تھوڑا سا حصہ' بھی تصوف کو سمجھنے میں کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی تصنیف Reconstriction of Religious Thought in Islam میں اسلامی زندگی کے متعدد و متنوع اساسی مسائل و مباحث کا تجزیہ کیا ہے، جن کے موضوعات ہیں۔...علم و مذہبی مشاہدات، مذہبی مشاہدات کا فلسفیانہ ذات الٰہیہ کا تصور اور حقیقتِ دعا، خودی، جبر وقدر، حیات بعد الموت، اسلامی ثقافت کی روح، اسلام میں اجتہاد اور کیا مذہب کا امکان ہے ! یہ عنوانات خود آشکارا ہیں۔ لے مگر ان پر بار بار اور نئے سرے سے غور و فکر کی ضرورت ہے۔اساسی مسائل و مباحث اپنی کمیت و کیفیت تبدیل و متحرک کرتے رہتے ہیں۔ان میں انتہائی ضروری واہم ذریعہ تصوف ہے۔جو اسلامی ثقافت کی روح میں اتری ہوئی ہے۔اس کی اساس توحید پر قائم ہے، جو مغربی ثقافت سے متضاد نہیں تو مختلف ضرور ہے۔مغربی فلسفہ روحانیت اور مادیت کی تفریق سے ہنوز آزاد نہیں

ہو سکا ہے، جبکہ ہمارے صوفیہ نے ایک ہزار سال قبل بتا دیا تھا۔۔۔عالمِ مادی عالم روحانی کی تجلی سے بیگانہ نہیں ہے! کبھی آپ نے اپنے بزرگوں کی اعلیٰ و فکر انگیز تصانیف کی جانب توجہ فرمائی، جو نقش بنی آپ سے فریادی ہیں! ان کی وسعت کا اندازہ علم تصوف سے متعلق کتابوں کے مباحث سے کیا جا سکتا ہے۔ علمِ تصوف کی اولین کتابوں میں امام زین العابدین(م:۶۰ھ/۶۷۰ء) کی تصنیف کتاب لصحیفۃ السجادیہ کا ذکر کیا جا سکتا ہے، جو حضرت علی ابن ابی طالب (م: ۴۱ھ/۶۶۱ء) کی بے مثل تصنیف نہج البلاغہ کے بعد اقوال ائمہ اہلبیت کا بہترین صحیفہ ہے۔امام جعفر صادق(م: ۱۱۷ھ/۷۳۴ء) سے صوفیہ کے تمام مکاتیب فکر اپنا سلسلہ قائم کرتے ہیں۔ان کی کتاب مصباح الشریعۃ کو علمِ تصوف میں اساسی حیثیت حاصل ہے۔ان کے علاوہ ذیل کے عنوانات کے تحت بعض دیگر اہم کتابوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے، تاکہ موضوع بیان کا اجمالی خاکہ ذہنوں میں ابھر سکے۔

(۱) تصوف کی اصولی کتابیں: خواجہ بسطامی کی شطحیات اور اس کی شرح جنیدی، خواجہ جنید بغدادی کی کتاب المناجات، ابو سعید اعرابی کی کتاب الوجد، ابو نصر سراج کی کتاب اللمع، القشیری کی الرسالۃ، ابو طالب کی قوت القلوب فی معاملۃ المحبوب، ابن عربی کی فصوص الحکم، جلال الدین سیوطی کی جلالین، منصور حلاج کی کتاب الطواسین، النیسابوری کی عیوب النفس، سعید الواعظ کی ریاض الانس، سید علی ہجویری کی کشف المحجوب، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی سطعات اور تیسری صدی ہجری کی کاوش رسائل اخوان الصفاء وغیرہ

(۲) صوفیہ کے تذکرے: امام غزالی کے بھائی احمد الغزالی کی سوانح العشاق ابو نعیم الاصبہانی کی حلیۃ الاولیاء، فرید الدین عطار کی سیر الاولیاء، شہزادہ دارا شکوہ کی سفینۃ الاولیاء، غلام سرور لاہوری کی تذکرہ خزینۃ الاصفیاء، سید محسن امین کی اعیان الشیعہ، سعید نفیسی کی تصوف در ایران، شاہ علی اکبر کی مجمع الاولیاء، شیخ سلیم چشتی کے داماد شیخ ابراہیم کی سلسلۃ الاسلام، امام بیگ عالم گیری کی ثمرات القدس وغیرہ (۳) ملفوظات و اقوال: امیر حسن سجزی کی فوائد الفواد، طوطیٔ ہند امیر خسرو کی افضل الفوائد، شمس العارفین قوام الدین کی قوام العقائد وغیرہ

(۴) مجالس: مثلاً ابن الجوزی کی مجال، شیخ یحییٰ منیری کی مونس المریدی شیخ قاضن

علا شطاری کی معدن الاسرار، شیخ حسن دائم بلخی کی کاشف الاسرار وغیرہ

(۵) دیگر مباحث: سید صدیق حسن کی الفرع المنامی فی اصل سامی، شاہ ولی اللہ کی الانتباہ فی سلاسل اولیااللہ ،شاہ ملک شجاع الملک کیکنز الانساب علی بن محمود جاندار کی درنظامی وغیرہ

ابتدا میں علم حدیث کے طرز پر صوفیہ نے اپنی تصانیف میں اسناد کو بنیاد بنایا تھا، جو بعد کے ادوار میں ترک ہو گیا، البتہ بیان اقوال کا سلسلہ جاری رہا۔ علم تصوف اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار میں کن کن اصطلاحی و معنوی مراحل سے گذرتا رہا، اس کے مطالعہ کا دائرہ سید علی ہجویری (م: ۴۶۵ھ / ۱۰۷۲ء) اور ابو القاسم القشیری (م: ۴۶۵ھ / ۱۰۷۲ء) سے امام غزالی (م: ۵۰۵ھ / ۱۱۱۱ء) پھر ابن عربی (م: ۶۳۸ھ / ۱۲۴۰ء) اور ان سے بعد کے صوفیائے کبار تک پھیلا ہوا ہے۔ سید علی ہجویری متعدد کتابوں کے مصنف تھے، مثلاً کشف المحجوب، منہاج الدین، الرعایۃ الحقوق اللہ، کتاب الفنا والبقا، اسرار الخرق والمونات، بحر القلوب، کتاب البیان لاہل العیان، دیوان شاعری وغیرہ لیکن دست بردزمانہ سے کشف المحجوب کے علاوہ کوئی کتاب باقی نہیں رہ سکی۔ کشف المحجوب تصوف کی اساسی کتب میں ہے۔ ابو القاسم القشیری نے رسالۃ القشیریہ کی تصنیف ۴۳۸ھ / ۱۰۴۶ء میں کی تھی۔ انھوں نے آغاز بیان میں لکھا ہے کہ ہر علم میں کچھ الفاظ ایسے ہوتے ہیں جن سے مخصوص معانی و مفاہیم ادا کیے جاتے ہیں لیکن بعض اوقات اظہار مطالب کی بجائے معانی و مفاہیم کا پوشیدہ رکھنا بھی مقصود ہوتا ہے، تاکہ ان لوگوں سے اسرار و مقامات مخفی رکھے جا سکیں، جن میں ان کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اس لیے تصوف میں دونوں طرح کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ ایسے الفاظ، جن سے معانی و مفاہیم واضح ہو جائیں اور ایسے الفاظ کہ جو رمز و علامت کا درجہ رکھتے ہیں۔ ۲

۱۰ویں، ۱۱ویں عیسوی (چوتھی، پانچویں صدی ہجری میں) عقیدہ تصوف کی تدوین وسیع تر پیمانے پر کی گئی۔ ابو نصر سراج (م: ۳۷۸ھ / ۹۸۸ء) کی کتاب اللمع تصوف کی اولین ممتاز کتب میں سے ہے۔ اس نے صوفیہ کو اصحاب الحدیث پر ترجیح دی ہے کیونکہ فقہاء محض علوم حدیث پر قدرت رکھتے ہیں، علمی استنباط اور اصول شرع تک محدود ہوتے ہیں جبکہ صوفیہ ان علوم سے بھی بہرہ ور ہوتے ہیں اور علم باطن سے بھی۔ اعمال بھی دو طرح کے ہوتے ہیں—— ایک وہ اعمال، جن کا انسان کی

جوارح جسمانی سے تعلق ہے اور دوسرے وہ اعمال، جو قوائے باطنی (قلب) سے متعلق ہیں۔ علماء و فقہاء خوارج ظاہری تک محدود ہوتے ہیں جبکہ صوفیہ فرد کے خوارج ظاہری اور قوائے باطنی دونوں سے واقف ہوتے ہیں۔ ان کا مشہور قول ہے: العلم ظاھر و باطن والقرآن ظاھر و باطن و حدیث رسول اللہ ظاھر و باطن والا سلام ظاہری و باطنی علم ظاہر و باطن کے اجتماع کے بغیر علم مکمل نہیں ہو سکتا۔ محض علم ظاہر کافی نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے صوفیہ کی تخصیص کے لیے تین امور پر خاص طور پر زور دیا جاتا ہے...: شریعت کی متابعت، زہد و ترک کی اہمیت اور سریت کا مرتبہ۔ ابو نصر سراج نے علم تصوف کو کتاب (قرآن) اور اثر (حدیث) پر مبنی قرار دیا ہے۔ [۳] ابو بکر محمد الکلاباذی (م: ۳۸۰ھ / ۹۹۰ء) نے واضح کیا ہے کہ احوال کی پیداوار اعمال سے ہوتی ہے۔ علم کو عمل میں تبدیل کرنے سے قبل بندے کو علم آفات نفس سے واقف ہونا چاہئے، جس کو صوفیہ علم حکمت کہتے ہیں۔ اس کے ذریعہ مراقبہ الخواطر، (دل میں جاں گزیں خیالات اور وساوس کو روکنا) اور تطہیر السرائر (مخفی خیالات سے پاک کرنا اور وجدان کی حفاظت کرنا) پر قابو حاصل کر سکتا ہے۔ [۴] ابو طالب محمد المکی (م: ۳۸۶ھ / ۹۹۶ء) کے طویل علمی و تحقیقی مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ علوم ظاہری (فقہ، اصول وغیرہ) درست ہیں، ان کی افادیت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا لیکن اصلی علوم ہیں... علوم الیقین اور علوم الباطن (یعنی علوم تصوف) باقی ہوں! [۵]

امام غزالی (م: ۵۰۵ھ / ۱۱۱۱ء) کی تعلیمات و تصنیفات میں احیاء علوم الدین اور المنقذ من الضلال نے جمہور اسلام کو بیحد متاثر کیا ہے۔ المنقذ ان کی خود نوشت سوانح عمری ہے، اس میں انھوں نے صوفیانہ زندگی کو افضل ترین زندگی قرار دیا ہے۔ غزالی اپنے 'مقصد' (جس کو معتقدین 'وظیفہ' کہتے ہیں) یں غیر معمولی طور پر کامیاب ہوئے۔ ان کے بعد اس وظیفے کو شیخ عبد القادر جیلانی نے (م: ۵۶۲ھ / ۱۱۶۶ء) سنبھالے رکھا لیکن ان کے مواعظ کا ایک دھندلا سا تصور ہی امتداد زمانہ سے باقی رہ سکا۔ شیخ عبد القادر جیلانی کے قریبی روحانی اولاد کی حیثیت سے محی الدین ابن عربی (م۔ ۱۲۴۰ء) کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

ہندوستان میں صوفیہ کے تذکرے عموماً فارسی میں لکھے گئے، بعد میں جن کے ترجمے اردو میں

ہوئے جن میں چند کا ذکر درجِ بالا سطور میں ہو چکا ہے۔ان تذکروں میں صوفیہ کی نجی زندگی، سوانح حیات اور عقائد و تصورات کا بیان ہے ،ان پر شدید مبالغہ آرائی کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔اگر اس حقیقت پر نظر رکھی جائے کہ تذکرہ نگاروں نے اپنے پیر و مرشد یا اسی درجہ کے محترم بزرگ کے حالات اپنے ذاتی عقائد کی بنیاد پر رقم بند کیے ہیں تو مبالغہ آرائی کا الزام وارد نہیں ہو سکتا کیونکہ ذاتی عقائد کا معاملہ مبالغہ سے آزاد ہوتا ہے۔یا بہ الفاظ دیگر عقیدہ فی نفسہٖ مبالغہ پر مبنی ہوتا ہے۔ان تذکروں میں خوارق و کرامات کا خوب خوب بیان ہوا ہے۔ہندوستان میں سلسلہ چشتیہ سب سے زیادہ مقبول رہا ہے،اس لیے اس کے تذکرے بھی سب سے زیادہ ہیں۔ان میں سرور الصدور و نور البدور کو اولیت حاصل ہے، جو خواجہ بختیار کاکی (م: ۶۳۴ھ/ ۱۲۳۶ء) اور خواجہ حمید الدین ناگوری (م: ۶۷۲ھ/ ۱۲۷۳ء) کے ملفوظات پر مشتمل ہے۔ ضیاء الدین برنی نے شیخ فریدالدین محمود چاک پراں ناگوری (م: ۷۳۴ھ/ ۱۳۳۳ء) کے ملفوظات سلک السلوک لکھے۔خواجہ نظام الدین اولیاء(م:۷۲۵ھ/ ۱۳۲۴ء) کے حالات و ملفوظات پر مبنی کئی کتابیں ہیں، جنھیں عصری ماخذ کہا جا سکتا ہے۔ان میں (فوائد الفواد کا اردو ترجمہ خواجہ حسن ثانی نظامی نے اور قوام العقائد کا پروفیسر نثار احمد فاروقی نے کیا ہے۔دیگر اہم و معروف کتابوں میں سید محمد بن مبارک علوی امیر خورد کرمانی (م:۷۷۰ھ/ ۱۳۶۸ء) کی سیر الاولیاء فی محبت الحق جل و علا، اللہ دیا چشتی کی سیر الاقطاب عبدالقدوس گنگوہی کی رشد نام عبدالرحمن چشتی کی مراۃ الولایت، مراۃ مدار اور مراۃ الاسرار علی اکبر حسین اردستانی کی محفل الاصفیاء و مجمع الاولیاء، محمد غوثی شطاری کی گلزار ابرار، خلیفہ خویشگی کی معارج الاولٰیت وغیرہ اہم ہیں لیکن یہ ذکر شہزادہ دارا شکوہ (م۔ ۱۶۵۸ء) کے عہد آفرین تذکرہ سفینۃ الاولیاء اور سکینۃ الاولیاء کے بغیر مکمل نہیں کیا جا سکتا، جس میں علم و فضل، ریاضت و عبادت اور روحانی زندگی کے اصول و ضوابط بیان کیے گئے ہیں اور مسئلہ سماع پر عملی بحثیں ہیں۔ اسلامیات سے متعلق زیادہ تر کتابوں میں تصوف کا ذکر ناگزیر رہتا ہے۔ ہندوستان میں تصوف سے متعلق متعدد کتابیں دیگر مذاہب کے اہل قلم کی بھی مرہون منت ہیں۔ان کے پہلو بہ پہلو ہندوستانی مسلمانوں میں تصوف سے متعلق متعدد کتابوں کا سلسلہ ہر دور میں رہا ہے اور ہنوز جاری ہے۔

❁ سریت : نفوذ و اثرات :

تصوف کے پردے میں غیر اسلامی عناصر خصوصاً سریت کے فروغ کا سبب بنوامیہ کی زائیدہ عرب قومیت کا تصور ہے، جس کے نتائج بعد کے ادوار میں برآمد ہوئے۔ تصور عرب قومیت نے اسلامی تصور حیات کو شدید صدمہ پہنچایا۔ اسلام نے ملتوں کو مٹاکر اجزائے ایمان بنادیا تھا لیکن بنوامیہ نے عرب قومیت کے نام پر دوبارہ موروثی حکمرانی کو معیار ایمان بنادیا۔ حکمرانی کے عرب پنجوں میں غیر عرب موت سے بدتر حیات کرتے رہے۔ بالآخر عوام نے حکمرانی کے پنجوں کو توڑ دیا۔ اس عرب قومیت کے ردعمل میں تحریک شعوبیت، نے جنم لیا۔ جس کا نعرہ تھا کہ عربوں کو غیر عربوں پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے لیکن جلد ہی اس تحریک نے عرب مخالف اور ایران موافق تحریک کی شکل اختیار کرلی۔ متعدد ایسے لوگ، جن کے دلوں میں اسلام کے خلاف شکوک تھے، شعوبی تحریک کے زیر سایہ آگئے۔ ان کو 'زنادقہ' کہا گیا۔ ۶ انھوں نے مانی، زردشت اور مزدک کے مذاہب و عقائد کو زندہ کرنا شروع کیا۔ یہ لوگ عباسی خلیفہ منصور کے عہد (۵۸-۱۳۶ھ/۷۵-۷۵۴ء) میں پوری طرح سر اٹھا چکے تھے۔ اس کا سبب پہلوی اور فارسی زبان کے تراجم تھے، جنھوں نے کئی طرح کے سوالوں کو جنم دیا تھا۔ یے شعوبیت کے زیر اثر تصوف کے خدوخال بھی بدلے، جس کو ایرانی تصوف کہا جا سکتا ہے۔ اس ایرانی تصوف کا اسلامی عقائد سے تقابلی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایرانیوں نے ظہور اسلام سے قبل کے اپنے افکار کو کلیتاً ترک نہیں کیا تھا بلکہ حیلوں اور چالاکیوں سے قدیم عقائد کی نگہداشت کرتے رہتے تھے۔ یہ بات شعوبی تحریک میں سب سے زیادہ ابھر کر سامنے آئی۔ بقول پروفیسر سعید نفیسی تقریباً تمام شعوبی ایرانی تھے اور اگر ایران کے باہر دوسری جگہوں پر بھی کچھ شعوبی پیدا ہوئے تو ان میں بھی اس نئی فکر کی بنیاد ڈالنے والے گروہ کے رہنما ایرانی تھے۔ عربوں کے درمیان جو سب سے زیادہ فعال اور طاقت ور شعوبی پیدا ہوئے، وہ 'اصحاب الزنج' تھے جن کا رہنما رے کا رہنے والا ایک شخص علی محمد تھا۔ یہی حال قرامطہ کا ہے۔ قرامطہ کا بھی رہنما بھی ایرانی بھی تھا۔ اہم ترین شعوبی تحریک ایرانی تصوف کی شکل میں منتہی ہوئی۔ ۸ے

تصوف کے سرّی محرکات کو مطالعہ و تجزیہ کی سہولت کے پیش نظر تین زمروں میں تقسیم

کرنا مناسب ہوگا۔ اولاً: عراق اور جزیرہ (دجلہ و فرات کے درمیان کی سرزمیں) کا تصوف، جو نستوری نصرانیوں، یعقوبیوں، صابئیوں، مرقیوں، ابن دیلمان اور ہرمز کے تعلیمات سے متاثر رہا۔ دوئم: ایران اور ہندوستان کا تصوف، جس پر زردشت، مانی، ویدانت اور بدھ تعلیمات کے اثرات نظر آتے ہیں۔ سوئم: مصر شام، مغرب اور اندلس کا تصوف، جس پر نوفلاطونیت، ابی قوریت، رواقیت اور عیسائیت کی پرچھائیاں دکھائی دیتی ہیں۔ اس سلسلے میں تاریخی تقدم کو صرف نظر نہیں کرنا چاہئے کہ تصوف پہلے عراق و جزیرہ کی سرزمیں میں عالم وجود میں آیا، پھر ایران و ہندوستان میں پھیلا اور آخر میں مصر سے اندلس تک پہنچ گیا۔ ان تینوں علاقوں کا تصوف باہمی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ البتہ بعض امور میں ہم آہنگی بھی ہے۔ اگر ان کو سامی اور غیر سامی تصورات و عقائد کے اعتبار سے تقسیم کیا جائے تو آریائی تصورات و عقائد ہند ایرانی تصوف پر واضح طور پر نظر آتے ہیں اور سامی تصورات و عقائد عراق و جزیرہ اور مغربی تصوف کی اساس بنتے ہیں۔ پھر پورا تصوف نظریاتی اعتبار سے دو زمروں میں تقسیم ہو جاتا ہے ... سامی تصورات اور آریائی تصورات۔ یہ دونوں تصورات بیشتر مسائل و مباحث میں ایک دوسرے سے متصادم و متحارب نظر آتے ہیں۔

یونانی حکمت حران اور شام کی راہوں سے عراق و جزیرہ میں داخل ہوئی تھی ۔ یہ وہی راہیں تھیں، جن سے اسلام مغرب میں وارد ہوا تھا۔ شامیوں نے یونان کے آخری نظام فلسفہ نوفلاطیت کو اختیار کر لیا۔ غلطی یہ ہوئی کہ اس کو ارسطو (م:۳۲۲ق م) کا اصلی فلسفہ سمجھ بیٹھے۔ تا آنکہ فلوطینس (م:۲۷۰ء) کی اپنی دس (Enneads) کو 'ارسطو کی دینیات' قرار دے کر صدیوں تک بحث و تکرار کرتے رہے۔ حالانکہ ان دونوں اساتذہ فلاسفہ یونان کے تفکر میں نمایاں فرق ہے ۔[9] فلاطون کے نظریۂ عینیت (Idealism) اور فلوطینس کے نظریۂ صدور (Emanation) کے خلط ملط ہو جانے کی بنا پر تصوف کی نشو و نما پر دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔ اس دور کے صوفیہ و مشائخ تذبذب میں تھے کہ مندرجہ ذیل تین تشریحوں میں کس کو قبول کریں اور کیوں؟[10]

اولاً: تشریح اتحادیہ :ابن مسرہ اور اخوان الصفا سے فارابی اور ابن قسی تک اتفاق رائے تھی کہ نفس منفعل کو عقل فعال متاثر کرتی ہے تو اس کے تشکیل معانی کو اتحاد کہتے ہیں۔ عقل فعال کی

تشریح میں بھی اختلاف تھا بعض اس کو فیض الٰہی اور بعض نور محمدی قرار دیتے تھے۔

ثانیاً: تشریح، اشراقیہ: سہروردی اور حلبی سے دوانی اور صدرالدین تک جو ہر روح پر زور دیتے تھے۔ان کا قول تھا کہ روح نور یزدی کا شرارہ ہے، جو زندگی کے عقل فعال سے روشنی حاصل کرتی ہے۔

ثالثاً: تشریح وصولیہ :ابن سینا سے ابن طفیل اور ابن سبعین تک کا خیال ہے کہ روح ذات الٰہیہ سے ہم آہنگ ہوتی ہے تو ایک ایسے وجود جامع کا شعور بیدار ہوتا ہے، جس میں تعدد اور امتیاز باقی نہیں رہتا۔

چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) سے یونانی حکمت کے زیر اثر، جو قرامطہ عرفانیت (Gnostic) طبیب رازی (م:: ۳۲۰ھ / ۹۳۲ء) سے ابن سینا (م: ۴۲۹ھ / ۱۰۳۷ء) تک پھیلتی گئی، صوفیہ و مشائخ مابعد الطبیعاتی مصطلحات وضع کرتے رہے۔ نوفلاطونیت کا خدا ہر جگہ موجود بھی ہے اور موجود نہیں بھی ہے۔ وہ موجود اس طرح ہے کہ وہی تمام اشیاء کی علت ہے۔ اشیاء موجود ہیں۔اس لیے وہ بھی موجود ہے اور موجود نہیں ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ اشیاء الگ الگ وجود رکھتی ہیں، اس لیے خدا کا وجود کہیں بھی نہیں ہے۔ اس سے نکتہ پیدا ہوا کہ اگر خدا کا وجود ہر جگہ ہوتا تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کہیں نہیں ہے تو اس صورت میں خدا ہی سب کچھ ہوتا۔[۱۱] اسی کو صوفیہ 'ہمہ اوست' کہتے ہیں۔ البتہ نو فلاطین مادے کے استمرار یا استقلال کو کسی حد تک جائز قرار دیتے ہیں جبکہ صوفیہ تمام عالم امکان کو تجربات کے ذریعہ دیکھتے ہیں۔ تجربات خواب ہیں، قید زندگی بھی ایک خواب کا نام ہے، جس سے موت ہی بیدار کر سکتی ہے۔ اسی تفکر سے شیخ محی الدین ابن عربی (م: ۶۳۸ھ / ۱۲۴۰ء) نے نظریہ وحدت الوجود کی تشکیل کی۔ ابن عربی اندلس نژاد تھے۔ بعد میں دمشق آئے اور وہیں بس گئے۔ان کا خاندان عرب کے مشہور قبیلہ طائی سے تھا۔ وہ نوفلاطونیت سے، دیگر صوفیہ کے مقابلہ میں، مکانی اعتبار سے بھی قریب تھے اور تفکر کے معیاروں پر بھی۔

تصوف میں سریّت داخل کرنے اور اس کو فروغ دینے میں ان یہودی اور عیسائی علماء و حکماء اور مفکرین کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، جنھوں نے کبھی باہر سے اور کبھی دائرۂ اسلام میں داخل ہو کر اپنے

مذہبی تصورات کو اسلامی رنگ و آہنگ عطا کرنے کی شعوری کوشش کی۔ حالانکہ اسلام نے تمام انبیاء و مرسلین کو ایک ہی دین کا رہنما قرار دے کر ادیان عالم کو کامل وحدت کے رشتہ میں منسلک کیا ہے لیکن دنیا کے تین بڑے مذاہب، یہودیت، مسیحیت اور اسلام، جو سامی نژاد ہونے کی بنا پر متعدد مشترک خصوصیات کے حامل ہیں، باہمی طور پر ہم آہنگ نہیں ہو سکے۔ اسلام کے ساتھ ان کا رویہ حلیفانہ ہونے کی بجائے حریفانہ بلکہ بڑی حد تک معاندانہ رہا۔ خصوصاً اہل یہود کو مسیحیوں کے مقابلہ میں اسلام سے زیادہ ہی مخاصمت رہی ہے۔ یہ حقیقت عیاں راچہ بیاں ہے۔ وہ علماء و مشائخ قبول اسلام سے قبل یہودی یا نصرانی رہ چکے تھے، ان کے دیرینہ تصورات و معمولات خواہ کتنے ہی غیر شعوری کیوں نہ ہوں، غیر اسلامی اساس رکھتے تھے اور تصوف میں ان کی اثر پذیری سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ حقیقت تقلیدی و پرستاری عینک اتار دینے پر ہر شخص کو نظر آسکتی ہے کہ یہودی اور نصرانی مذاہب کی تعلیمات کو سب سے پہلے محمد بن عبد اللہ بن مسرہ (م: ۳۱۹ھ/۹۳۱ء)، پھر ابوالعباس رفاعی (م: ۵۱۲ھ/۱۱۱۸ء) احمد شاذلی (م: ۶۵۷ھ/۱۲۵۸ء) اور سید احمد بدوی مصری (م: ۶۷۱ھ/۱۲۷۶ء) اور خاص کر شیخ محی الدین ابن عربی (م۔ ۱۲۴۰ء) نے مغربی تصوف کا جزو بنادیا۔ ۱۲

اسلامی علماء و مشائخ کی زندگیوں پر بسا اوقات اہل یہود اور مسیحیوں کے فکری اثرات کی نشان دہی ہوتی رہی ہے، اس سے صاف انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی واضح ترین مثال خانقاہی رہبانیت ہے۔ اس تصور کے مطابق دنیا ایک قید خانہ ہے۔ روح جسم کی قید میں ہے۔ انسانی خواہشات قفس کی تیلیاں ہیں۔ ان سے انسان اسی صورت میں نجات حاصل کر سکتا ہے، جب وہ اس قید خانہ کی دیواریں توڑ دے اور روز افزوں خواہشات کے قفس سے اپنی روح کو آزاد کرالے۔ اپنی جبلت اور جبلی خواہشات کو کچل کر فنا کر دے۔ دین کے اسی نظریے کو رہبانیت یا ویراگ کہا گیا ہے۔

رہبانیت کے متعلق قرآنی ارشاد انتہائی واضح ہے کہ کسی سخن سازی کی گنجائش نہیں رہتی، ملاحظہ ہو: ورهبانية ابتدعوها ما كتبناها عليهم (اور جس رہبانیت کو ان لوگوں نے از خود ایجاد کر لیا تھا: الحدید ۵۷/۲۷) اس سے واضح ہے کہ خدا کی جانب سے کسی بھی شریعت کے لیے رہبانیت وارد نہیں ہوئی ہے بلکہ بعض بندوں نے خود ایجاد کر لیا ہے، جس کو اللہ تعالیٰ کی پسندیدگی

حاصل نہیں ہے۔ رسول اسلام کی واضح حدیث موجود ہے: لا رهبانية في الاسلام (اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔) اس مشہور حدیث کو اکثر صوفیہ غیر مستند اور موضوعی و مجہول قرار دیتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ حدیث تیسری صدی ہجری (نویں صدی عیسوی میں) اس لیے وضع کی گئی کہ قرآن مجید کی مذکورہ آیت سورہ الحدید، جس میں رہبانیت کا ذکر آگیا ہے، موکد بنادیا جائے۔ مستشرقین میں لوئس میسین نے خاص طور پر اولین تین صدیوں کے مفسرین مثلاً مجاہد اور ابوامامۃ الباہلی کی اسناد پیش کی ہیں تا آنکہ مخالف تفسیریں شایع ہوئیں اور زمخشری نے اسے مروج و عام کر دیا۔ یہ مشہور حدیث وضعی ہو سکتی ہے لیکن اس کا کیا جواز پیش کیا جائے گا کہ رسول اسلام کی دیگر بکثرت احادیث بھی موجود ہیں، جن میں راہبانہ زندگی سے مختلف زندگی گذارنے کی تعلیم دی ہے۔ مثلاً نکاح سے گریز کرنا، خصی ہونا، مسلسل عبادت سے اذیت میں پڑنا، شب بیداریاں کرنا، اہل عیال کے حقوق سے بے اعتنائی برتنا وغیرہ پر سخت تنقید کی گئی ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے صوفیہ میں رہبانیت کے رجحان پر تلخ و ترش تبصرہ کیا ہے کہ جاہلیت راہبانہ نے علماء مشائخ، زہاد اور پاک بازوں پر حملہ کیا، جس سے اسلامی معاشرہ میں مایوسانہ نقطہ نظر پھیل گیا۔[۱۳] ڈاکٹر سعید نفیسی کا خیال کہ رسم وراہ خانقاہی مرتب کرنے کا تصور مانیوں سے ماخوذ ہے۔ عربوں نے فارسی لفظ 'خان گاہ' کو معرّب کر کے 'خان قاہ' بنادیا۔ شہر سمرقند میں مانیوں کی خانگاہیں ہیں، جن کو مقامی زبان میں 'نفوشاک' کہتے ہیں۔[۱۴]

تصوف کے آریائی تصورات میں سریت سامی تصورات کے مقابلے میں زیادہ واضح و یقینی نظر آتی ہے۔ آریوں کا مرکز اصلی پامیر ہے، جو موجودہ تاجکستان میں شامل ہے۔ اسی پامیر سے نقل مکانی کر کے آریہ ہندوستان اور ایران میں آباد ہوئے۔ رگ وید اور اوستا کی داستانوں کی مماثلت ان کے تصورات کی یکسانیت نمایاں کرتی ہے۔ فارسی زبان میں ایک گھاس کا نام 'ہنومہ' ہے، جو زردشتیوں کی عبادت میں استعمال ہوتی ہے۔ سنسکرت میں 'ہ' تبدیل ہو کر 'س' ہو گیا۔ اس کا ہندو نام 'سوم' (सोम) ہے، جو دیوتاؤں میں 'اگنی' اور 'اندر' کے بعد متبرک ترین شے ہے۔ آکاش پر چندرما ہے، سورگ کی لتا اور رس ہے۔ اس طرح کی صدہا مثالیں ہیں۔ مثلاً زردشتی کستی، ہندو 'جینو' زردشتی، گوتمہ، اور سنسکرت گوتم وغیرہ۔ ہندوستان سے باہر، جن علاقوں میں بودھیت کو مقبولیت حاصل ہوئی، ان میں

موجودہ افغانستان شامل ہے۔ایسے کتبے دستیاب ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ۲۵۶ ق م میں بودھیت افغانستان میں رائج ہو چکی تھی۔۱۵ بلخ بودھیت کا عالمی مرکز رہا ہے، جس کی زیارت کے لیے زائرین بیرون جات سے آتے تھے۔ 'برمکی' سنسکرت کے 'پرمکھ' (प्रमुख) ماخوذ ہے، جو بلخ کے بودھ معابد 'نووہار' (नवविहार) سے تعلق رکھتے تھے جو مفرس ہو کر 'نوبہار' ہو گیا ہے۔بلخ کو یونانی سلطنت میں مرکزیت حاصل تھی اور اس کا رشتہ زردشت سے بھی تھا۔صوفیہ میں ممتاز شخصیتیں بلخ سے وابستہ ہیں مثلاً شیخ ابواسحٰق ابراہیم بلخی (م:۱۶۴ھ/۷۸۰ء) شیخ ابو علی شقیق بلخی (م:۱۹۵ھ/۸۱۰ء) شیخ ابو عبداللہ محمد بن فضل بلخی (م:۳۱۹ھ/۹۳۱ء)، طوطی ہند امیر خسرو (م:۷۲۵ھ/۱۳۲۴ء) مولانا جلال الدین رومی (م:۶۷۲ھ/۱۲۷۳ء) وغیرہ۔ شیخ ابو اسحٰق ابراہیم بن ادھم بھی بلخی شہزادے تھے۔ان کی حیات اور گوتم بدھ کی زندگی میں کئی مماثلتیں ہیں۔دونوں نے تخت و تاج کو خیر باد کہا اور درویشی اختیار کی۔ان کے پیغامات میں بھی ہم آہنگی ہے۔۱۶ سرخیل طائفہ ریشیان کشمیر شیخ العالم نور الدین نورانی (م:۸۲۰ھ/۱۴۱۷ء) اور مہاتما بدھ میں چھبیس مماثلتوں کا ذکر کیا گیا ہے جو کشمیر کے دیگر ریشیوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔۱۷

قدیم ایرانی مذہب کا بانی و پیشوا مانی (م۔۲۷۵ء) خود کو زردشتی مذہب کا سیوشیانس، مسیحی مذہب کا فارقلیط موعود اور بودھ موعود کہتا تھا۔اس کا باپ ایرانی نژاد تھا لیکن ہمدان سے ہجرت کر کے بابل میں آباد ہو گیا تھا، جہاں مانی (۲۱۶-۲۱۵ء میں) پیدا ہوا۔یہ وہ زمانہ تھا کہ اس کے وطن میں بدھ مت کا بہت زور تھا۔اس نے ایران قدیم کے پیغمبر زردشت کے برعکس، جو دینیاتی نقطہ نظر سے موحد اور فلسفیانہ زاویہ نظر سے ثنویہ تھا اور جس کے پیش نظر یہ مسئلہ رہا کہ بدی کے وجود اور خدا کے ازلی نیکی میں صلح کرا دی جائے۔اس لیے تعلیم دی کہ اشیاء کی کثرت و گوناں گونی کا سبب نور و ظلمت کی قوتوں کا اتصال ہے۔یہی نظریہ صوفیہ میں مختلف روپ دھارن کر کے کبھی تصور اتحاد و حلول میں معاون ہوا تو کبھی تصور حقیقت نور کی حیثیت سے جلوہ گر ہوا۔مانی کے تصور کونیات اور ہندوستانی مفکر کپل میں حیرت انگیز مماثلت ہے، جس نے کائنات کی توجیہ تین علتوں سے بیان کی تھی—نیکی یعنی ستیہ (सत्व) ظلمت یعنی تمس (तमस) حرکت یا جذبہ یعنی رجت (रजत)۔ویدانتیوں نے کائنات کو التباس قرار دے کر

مسئلہ کا حل تلاش کیا۔ صوفیہ اسی مفہوم کو التباس کی بجائے تعینات کے ذریعہ حل کرتے ہیں۔ان کے نزدیک نفس کی معرفت حاصل کرنا رب شناسی کا وسیلہ ہے۔ جو حضرت علی کے مشہور و معروف قول من عرف نفسہٗ عرف ربہ (جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا) پر مبنی ہے جس کی بنیاد پر مشہور فرانسیسی فلسفی ڈیکارٹ نے کہا... میں سوچتا ہوں،اس لیے میرا وجود ہے۔اسی خیال کو صائب تبریزی نے اپنی ایک غزل میں پیش کیا ہے، جس کا مطلع ہے:

در ہیچ پردہ نیست کہ نبود صدای تو
عالم پر ست از تو وخالی ست جائی تو

❁ وحدت الوجود:

تصوف میں عقیدہ وحدت الوجود کو اساسی اہمیت حاصل ہے لیکن اس کے مآخذ کے متعلق شدید اختلافات ہیں۔ اگرچہ وحدت الوجودی تصورات کی اساس اسلامی شریعت ہے لیکن اس میں نوفلاطونیت، یہودیت اور عیسائیت کے مغربی اثرات، زردشتیت ومانیت کے ایرانی عوامل اور بدھیت، ویدانت اور اُپ نشد کے ہندوستانی عناصر کی کار فرمائی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مزید بر آں مولانا جلال الدین رومیؒ (م۔ ۶۷۲ھ/ ۱۲۷۳ء) نے نوفلاطونیت کے اثرات کو قرآنی آہنگ عطا کر دیا۔[۱۸] خلافت بنو عباس کے اولین دور (۳۳۹۔۲۶۱ھ/ ۹۵۰۔ ۸۷۴ء) میں بغداد مغرب و مشرق کا سنگم بنا تو عرب وغیر عرب تہذیبی اختلاط میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے تصوف کو نصرانی ویہودی اولیاء سے نسبت دیدی ہے، حتیٰ کہ ایک سامی النسل فرد لقمان کو، جو بابل کے رہنے والے تھے، پیغمبروں کی فہرست میں شامل کرلیا۔[۱۹] تصوف کے اولین مراکز، جہاں سے تصوف دنیا بھر میں، اور خاص طور پر ہندوستان میں پھیلا، ماوراالنہر، سمرقند اور بخارا تھے، جو بدھیت کے زبردست مراکز رہ چکے تھے۔[۲۰] البیرونی (م: ۴۴۰ھ/ ۱۰۴۸ء) اور بعدہٗ شہزادہ داراشکوہ (م:۹۶۶ھ/ ۱۵۵۸ء) نے اُپ نشدوں سے عقیدۂ وحدت الوجود کی حقانیت ثابت کی۔ ایرانی تصوف کے مآخذ میں زردشت ومانی کے اثرات واضح ہیں۔[۲۱] غالباً صوفیہ جس چیز کو 'وسیع المشربی' قرار دیتے ہیں، مختلف عقاید و مذاہب سے اکتساب کا دوسرا نام ہے۔

عقیدۂ وحدت الوجود کی اساس چند آیات کریمہ پر بیان کی جاتی ہے پہلی آیت : ولله المشرق والمغرب فاینما تولوا فثم وجه الله ان الله واسع علیم(اور اللہ کے لیے مشرق بھی ہے اور مغرب بھی لہٰذا تم جس جگہ بھی قبلہ کا رخ کر لو گے، سمجھو، وہیں خدا موجود ہے، وہ صاحب وسعت بھی ہے اور صاحبِ علم بھی: البقرہ ۲/۱۱۵)اس میں مشرق و مغرب (یعنی ہر جگہ) خدا کے موجود ہونے، اس کے صاحب وسعت اور صاحب علم ہونے اور عبارت کی تاکید کے لیے دلیل ہے۔ دوسری آیت: کل شئی هالك الا وجهه(اس کی ذات کے ماسوا ہر شے ہلاک ہونے والی ہے: القصص ۲۸/ ۸۸)اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے علاوہ ہر شے کے ہونے کی دلیل ہے۔ تیسری آیت: کل من علیہا فان(جو بھی روئے زمین پر ہے، سب فنا ہو جانے والے ہیں: الرحمٰن ۵۵/ ۲۶) چوتھی آیت: ویبقیٰ وجه ربك ذوالجلال والاکرام (صرف تمہارے رب کی ذات جو صاحب جلال واکرام، وہی باقی رہنے والی ہے: الرحمٰن ۵۵/ ۲۷)اللہ تعالیٰ اپنی بقا کا اعلان اپنے جلال و اکرام کے ساتھ کرتا ہے۔ جلال سے بندہ میں خوف پیدا ہوگا، لہٰذا اکرام کا ذکر کردیا گیا تاکہ بندہ مایوس نہ ہو لیکن عذاب الٰہی سے لاپروائی نہ برتے بلکہ درمیانی زندگی گذارے۔ خوف کے ذریعہ بدی کو روکا جاسکے اور اکرام کے ذریعہ نیکیوں کا حوصلہ پیدا کیا جاسکے۔ پانچویں آیت: هو معکم این ماکنتم (وہ تمہارے ساتھ تم جہاں بھی رہو۔ الحدید ۵۷/ ۲۵)

یہ آیاتِ کریمہ دلیل ہیں کہ حال ابدی(Eternal Present) میں ہر وہ شے جو ہلاک ہو سکتی تھی، ہلاک ہو چکی ہے۔ اسی طرح ہر وہ شے جو فنا ہو سکتی تھی، فنا ہو چکی ہے اور اب صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات باقی ہے اور باقی رہے گی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مخلوقات کی کثرتِ وجود کے حجاب میں، تمام موجودات میں صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی حقانی وحدت موجود ہے لیکن اس سے یہ مفہوم نہیں پیدا کرنا چاہئے کہ ذات باری تعالیٰ متعدد اجزا پر مشتمل ہے۔ بلکہ اس حقیقت کو ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ مخلوقات کے ایک دوسرے سے مختلف و منفرد ہونے کے باوجود لامتناہی کاملیت باری تعالیٰ اپنی غیر منقسم کلیت کی صورت میں موجود ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ بھی لامتناہی نہ ہوتا۔ اس تصور کو مزید تقویت عطا کرنے کے لیے صحیح بخاری سے یہ حدیثیں پیش کی جاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ تھا اور

اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا... وہ آج بھی ویسا ہی ہے، جیسا کہ کبھی تھا۔ ۲۲

صوفیہ کا عقیدہ ہے کہ رسول اسلام نے قرآنی تعلیم کے علاوہ حضرت علی ابن ابی طالبؑ کو ایک باطنی تعلیم و حکمت بھی عطا کی تھی جس کی تائید حضرت علی کے ایک خطبہ سے بھی ہوتی ہے، جب انھوں نے فرمایا: فوالذی خلق الجنه وبرأانسمه ان الذی انتئکم هی۔ عن النبی الامی صلی الله علیه وآله وسلم (اس ذات کی قسم، جس نے دانہ کو شگافتہ کیا اور ذی روح کو پیدا کیا، میں تمھیں خبر دیتا ہوں، وہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے پہنچی ہے ۔ نہج البلاغہ: خطبہ ۹۹) اس کے مماثل متعدد اقوال نہج البلاغہ میں ملتے ہیں۔

صوفیہ باطنی تعلیم (حکمت) کے دعویٰ کی تائید میں قرآن کی یہ آیت پیش کرتے ہیں: کماارسلنا فیکم رسولامنکم نتلواعلیکم آیتنا ویزکیکم ویعلمکم الکتب والحکمة ویعلمکم مالم تکونوا تعلمون۔ (جس طرح ہم نے تمھارے درمیان تمھیں میں سے ایک رسول بھیجا ہے، جو تم پر ہماری آیات کی تلاوت کرتا ہے۔ تمھیں پاک وپاکیزہ بناتا ہے اور تمھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور وہ سب کچھ بتاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔ البقرہ ۲/۱۵۱) اسی طرح قرآن نے مسلمان کی یہ تعریف کی ہے: الذین یومنون بالغیب ویقیمون الصلوة ومما رزقنهم ینفقون (جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔ پابندی سے پورے اہتمام کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے رزق دیا ہے، اس میں سے ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ البقرہ ۲/۳) پھر 'غیب' کے متعلق کیا؟ اور کیوں؟ کس طرح؟ کے سولات پیدا ہوتے ہیں جن کا جواب بھی قرآن میں موجود ہے کہ اس 'غیب' کو کہیں ماورٰی تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تمہاری روح میں موجود ہے۔ آیات ملاحظہ ہوں: وفی الارض آیات وللموقنین ۔ وفی انفسکم افلا تبصرون (اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ اور خود تم میں بھی۔ کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو: الذاریات ۵۱/۲۰) پھر اس 'غیب' کی ماہیت بھی بیان کر دی گئی۔ الله نور السموت والارض (اللہ آسانوں اور زمین کا نور ہے: النور ۲۴/۳۵) اور اس نور کے متعلق ارشاد ہوا: لیس کمثله شئی (اس کا جیسا کوئی نہیں: الشوریٰ ۴۲/۱۱)

ان آیات کریمہ کی روشنی میں صوفیہ کا وحدت الوجودی نقطہ نظر نموودار تقا حاصل کرتا ہے۔
اس کی چار منزلیں بتائی گئی ہیں — پہلی منزل یہ کہ غیب پر ایمان ہو۔ دوسری منزل یہ کہ غیب کی جستجو کرے۔ تیسری منزل یہ کہ غیب کا علم حاصل کرے۔ اور چوتھی منزل یہ کہ تحقیق کرے جو عدل واحسان کی مسلسل مشق سے حاصل ہوتی ہے۔ صوفیہ اس کا استنباط اس آیت کریمہ سے کرتے ہیں: ان الله يامر باالعدل والاحسان وايتاء ذى القربى وينهى عن الفحشاء والمنكر والبعض يعظكم لعلكم تذكرون (بیشک اللہ تعالیٰ عدل، احسان اور قرابت داروں کے حقوق کی ادائیگی کا حکم دیتا ہے اور بدکاری، ناشائستہ حرکات اور ظلم سے منع کرتا ہے کہ شاید تم اسی طرح نصیحت حاصل کرلو: النحل ۱۶/۹۰) اور غیب کی جستجو کے لیے ان آیات کریمہ سے استنباط کرتے ہیں: افلا ينظرون الابل كيف خلقت والى السماء كيف رفعت والى الجبال كيف نصبت۔ (کیا یہ لوگ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ اسے کس طرح پیدا کیا گیا ہے اور آسمان کو کس طرح بلند کیا گیا ہے، پہاڑ کس کس طرح نصب کیا گیا ہے: الغاشیہ ۸۸/۱۷،۱۸،۱۹) چونکہ روح کا معاملہ 'امر ربی' پر مبنی ہے، آیات کریمہ نازل ہوئی: قل الروح من امر ربى (اور پیغمبر یہ روح کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ یہ میرے پروردگار کا ایک امر ہے: الاسراء ۱۲/۵) اس سے واضح ہوتا ہے کہ ہر شے ادنیٰ سے ترقی کر کے اعلیٰ تک اپنے مبدائے فیاض (ذات باری تعالیٰ) سے اتحاد ووصل کی خواہش مند ہے۔ عین القضاۃ ہمدانی نے لفظ 'وجود' کو 'وجد' سے مشتق قرار دے کر دلچسپ نظریہ پیش کیا ہے کہ وجود کے معانی اللہ تعالیٰ کے ان صفات سے ہے، جسے وہ کلمہ ''کون' کے مقابل اپنے مخلوق کو عطا کرتا ہے۔ یعنی اس کا وجود مکان میں ہے۔

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی (م:۶۳۸ھ/۱۲۴۰ء) کو وحدۃ الوجود کے موسس کہا جاتا ہے، حالانکہ ان سے قبل شیخ ابو عبداللہ محمد سہل بن عبداللہ تستری (م:۲۸۳ھ/۸۹۶ء) اپنے مسلک سہیلی کے عقائد میں اس کی وضاحت کر چکے تھے۔ ان کے علاوہ منصور حلاج (م:۳۰۹ھ/۹۲۱ء) اور امام غزالی نے مشکواۃ الانوار میں اس عقیدہ کی وضاحت اور حمایت کی ہے، حالانکہ مسیغن اس کے خلاف ہے۔ ۲۳

ہمارے نزدیک شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کو عقیدۂ وحدۃ الوجود کا موسس یا موجد قرار دینے

کی بجائے، یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ عقیدہ تصوف جو قبل میں شیخ ابو عبداللہ تشتری، امام غزالی وغیرہ کی توجہ کی بنا پر اہمیت حاصل کر چکا تھا، اس کو شیخ اکبر نے زیادہ بہتر طور پر مرتب ومدون کر دیا۔ انھوں نے اپنے پیش روؤں سے زیادہ وحدت الوجودی نظریات پر زور دیا کیونکہ اس دور میں عقیدہ 'توحید کی توجیہ و تعبیر عددی اعتبار سے ہو رہی تھی۔ وحدت الوجود پر اصرار کا دوسرا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عقیدۂ وحدت الوجود کا پابند ہونے کی صورت میں صوفی کے لیے پر لازمی ہو جاتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی اعتبار سے خود کو 'حال ابدی' میں رکھے۔ 'حال ابدی 'صوفی کی آخری منزل ہے، جس کی نفی کرنا عقیدۂ وحدت الوجود کو لایعنی قرار دینے کے مترادف ہوتا ہے۔ وجود کے متعلق ابن تیمیہ کا مشہور قول ہے: وجود المخلوقات عين وجود الخالق (مخلوقات کا وجود عین وجودِ خالق ہے۔) اسلامی عقیدہ ہے کہ تخلیق کائنات سے قبل فقط ذات باری تعالیٰ کا وجود تھا۔ اس نے کائنات کو خلق کیا، جس سے عالم موجودات وجود میں آیا۔ اس طرح موجودات کا سلسلہ لامتناہی شروع ہوا۔ ان میں بھی موجودِ مطلق ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ ایک بار کسی نے ابن عربی سے سوال کیا— کیا غلاظت یا مردار کو دیکھ کر آپ کہیں گے کہ یہ خدا ہے؟ ابن عربی تڑپ اٹھے، بولے— استغفر اللہ! یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ ہمارا مخاطب وہ ہے جو بینائی رکھتا ہے، پیدائش اندھا نہیں ہے۔ ۲۴

ابن عربی نے وحدت الوجود کے علاوہ اسمائے ذات و صفات الٰہی، انسانِ کامل، حقیقتِ محمدی، حقیقتِ وجود تخلیقِ کائنات اور وحدت مذاہب پر روشنی ڈالی ہے لیکن ان کا فکری محور وحدت الوجود کے گرد و پیش گھومتا ہے۔ ان کے نزدیک ماسوا ذات الٰہی باقی تمام مخلوقات تعینات ہیں۔ فقط ذات باری تعالیٰ بلا تعین ہے جو چھ مختلف مراتب (تنزلات) سے گذر کر عالم ممکنات میں ظہور کرتی ہے۔ یہ تنزلات مختلف شئونات کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ ان کو تنزلاتِ ستہ، تعیناتِ ستہ یا مراتبِ ستہ بھی کہا جاتا ہے۔ ذیل میں ان کا اجمالی تعارف پیش کیا جاتا ہے:

تنزل اوّل: اس کو وحدیت یا حقیقت محمدیہ کہتے ہیں، جو تمام مخلوقات و موجودات کا ماخذ ہے۔ یہی ذات باری تعالیٰ اور مظاہر کونین کے درمیان واسطہ ہوتا ہے۔ اسی میں اللہ تعالیٰ کی اجمالی صفات جلوہ افروز ہوتی ہیں۔

تنزل ثانی: اس کو واحدیت کہتے ہیں۔ اس میں ذات باری تعالیٰ کی صفات کا تفصیلی ظہور ہوتا ہے۔ تنزل اوّل کے اتصال واتحاد سے تینوں تنزلات یعنی احدیت، وحدت اور واحدیت سے مراتب الٰہی جلوہ گر ہوتے ہیں۔ وحدیت اور واحدیت میں تمام ممکنات کے حقایق مضمر ہیں، جو تمام وکمال علم الٰہی میں موجود ہیں۔

تنزل ثالث : اس کو عالم ارواح یا عالم ملکوت کہتے ہیں۔ اس میں آسمانی دنیا کا بیان ہوتا ہے۔

تنزل رابع: اس کو 'تنزل مثالی' بھی کہتے ہیں۔ اس سے عالمِ مثال کا ظہور ہوتا ہے جس کا مقصد عالمِ ارواح اور عالم اجسام کے درمیان ربطِ باہمی پیدا کرنا ہوتا ہے۔

تنزل خامس: اس کو عالم ناسوت کہتے ہیں۔ اس سے عالم اجسام کا ظہور ہوتا ہے۔ جس کو کائنات کہتے ہیں۔

تنزل سادس: اس کو 'کون جامع' بھی کہتے ہیں۔ اس کا دوسرا نام 'حقیقت انسانیہ' ہے، جس کو 'عالم انسان' کہتے ہیں۔

مذکورہ بالا تنزلات میں آخری الذکر تین تنزلات کو تنزلات کونیہ یا مراتب کونیہ بھی کہا جاتا ہے۔ ابن عربی ذات محمدیہ اور حقیقت محمدیہ کو دو مختلف حقیقت قرار دیتے ہیں۔ وہ 'حقیقتِ محمدیہ' کو 'کلمۂ محمدیہ' یا 'النور المحمدی' بھی کہتے ہیں۔ الانعام ۶/ ۱۰۳۔

یہی تصورِ انسانِ کامل بھی ہے۔ الانسان الکامل کا عقیدہ ازمنۂ قدیم سے تمام صوفیہ میں مروج رہا ہے، ' المقربون' (وہ جو خدا کے قریب لائے گئے) کے حامل ہیں۔ سرکار دوعالم کے رحمت العالمین ہونے کی خصوصیت کو رب العالمین کی وسعتوں کے پہلو بہ پہلو قرب الٰہی کے تناظر میں بھی سمجھنا چاہئے: نحن اقرب الیه من حبل الورید (ہم اس سے رگ گردن سے زیادہ قریب ہیں (ق ۵۰/ ۱۵) یہی آیت صوفیہ کے تعینِ اتحاد کے لیے، جس کو ہمارے مستشرقین کرام عام طور پر 'سرّی اتصال' (Mystic Union) کہتے ہیں، اور جسے رہنما اصول کا درجہ عطا کرتے ہیں۔ تعینِ اتحاد ہمیشہ سامنے رہتا ہے مگر نظر نہیں آتا۔ البتہ اس کا ادراک ممکن ہے لیکن کسی مراقبہ ومجاہدہ کے ذریعہ ممکن نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ ذات باری تعالیٰ اس کو عطا کردے۔ قرآن نے واضح کردیا ہے: لاتدرکه

الابصار وھویدرك الابصار وھو اللطیف الخبیر. سورہ انعام: ۱۰۳/۶۔ (نگاہیں اسے پا نہیں سکتیں اور وہ نگاہوں کا برابر ادراک رکھتا ہے کہ وہ لطیف بھی ہے اور خبیر بھی ہے۔ ق ۱۵/۵۰) ابن عربی نے تصور انسان کامل پر اپنی کتاب فصوص الحکم میں بہت زور دیا ہے لیکن ان سے تین صدی قبل منصور حلاج نے کتاب الو اصلین میں اسی شدت سے تصور انسان کامل پر زور دیا ہے۔ اس کے خیال ہوتا ہے کہ ابن عربی کے تصور انسان کامل میں منصور حلاج سے اکتساب کیا ہے۔ اور مسلم اور عارفیت (Gnosticism) کا نظریہ نور محمدی، یونانی نظریہ بروز کے تصور عقل فعال سے ماخوذ ہو سکتا ہے۔

تصور انسان کامل پر عبدالکریم الجیلی (م۔ ۸۲۰ھ/ ۱۴۱۷ء) نے اپنے رسالہ الانسان الکمل میں تفصیلی بحث کی ہے۔ حالانکہ یہ کتاب ابن عربی کی کتاب الفصوص الحکم کی شرح ہے لیکن اپنی اہمیت میں کسی کتاب سے کم نہیں ہے۔ الجیلی انسان کامل کے ارتقاء کی تین منزلیں بیان کرتے ہیں۔ پہلی منزل اسماء الٰہی پر استغراق و مراقبہ ہے۔ جب خدا بندہ کو اپنے اسماء کے نور سے منور کر دیتا ہے تو بندہ اسی نور میں فنا ہو جاتا ہے۔ اس لیے جب خدا پکارتا ہے تو بندہ اس کی آواز کا جواب دیتا ہے۔ روحانی تادیب کی دوسری منزل 'تجلیِ صفات' ہے۔ بندہ صفات ربانی سے تجلی حاصل کر کے روح کائنات میں شامل ہو جاتا ہے۔ پھر انسان ہوا میں پرواز کرنے، پانی پر چلنے اور اشیاء کے جسم کو تبدیل کر دینے کی قدرت پیدا کر لیتا ہے۔ جیسا کہ حضرت مسیح نے کیا۔ تیسری منزل اسم و اعراض کے دائرہ سے گذر کر جوہر یا وجود مطلق کے قلمرو میں گامزن ہونا ہے۔ اس منزل پر سرکار دو عالمؐ فائز ہوئے۔ بالفاظ دیگر انسانِ کامل بندے اور خدا کے درمیان ایک کڑی ہے، جس میں ایک طرف بندہ اساس اسماء سے تجلی حاصل کرتا ہے اور دوسری طرف تمام صفات ربانی کا حامل بنتا ہے۔ یہ صفات ہیں: حیات یا وجودِ مستقل، علم، ارادہ، قوت، کلام، غیر مسموع کو سننے کی قوت، غیر مرئی کو دیکھنے کی صلاحیت، جمال فطرت، عظمت و جلال اور کمال یعنی خدا کا علم جو لامتناہی اور لامحدود ہے۔ ۲۵ الجیلی ویدانت کے زیر اثر دو قسم کے 'برہم' کا تصور کرتا ہے۔ ایک جس میں صفات ہوتی ہیں۔ دوسرے، جس میں صفات نہیں ہوتی۔ وہ فکر مطلق کو 'استیہ' (असत्य) قرار دیتا ہے اور اس کے ظہور پذیر ہو کر محدود ہونے کو ہونے کو 'ستیہ' (सत्य) کہتا ہے۔ ۲۶

ابن عربی کی اہم خصوصیت ہے کہ انھوں نے علم تصوف کو رمزی و علامتی زبان عطا کی۔

جس میں علم شعر، ہندسہ، ریاضی وغیرہ کی روشنی میں تاویلات پیش کیں۔ 'تاویل' کے اصطلاحی معانی کسی شے کے اصل کی طرف واپس ہونا ہے۔ ابن عربی کے نزدیک 'تاویل' کا مقصد ظاہر سے باطن کی طرف لوٹ جانا ہے۔ انھوں نے کائنات کی ہر شے کو ظاہر اور باطن میں تقسیم کر کے دیکھا۔ حتیٰ کہ شرعی احکامات میں بھی ظاہر و باطن کی تفریق کر دی۔ ظاہر و باطن کا شاخسانہ بعد کے ادوار میں کیا کچھ برگ و بہار نہ لایا۔ اس کے نتیجے میں بعض وحدت الوجودیوں نے عبادت کو غیر ضروری قرار دے دیا۔ ظاہر و باطن کی رمزیت ابن عربی تک محدود نہیں ہے۔ دیگر صوفیہ بھی ظاہر و باطن اور تاویلات کا عمل ساری کائنات پر جاری کرتے رہے ہیں۔

ابن عربی کے افکار و تصورات کی ترویج واشاعت میں صدرالدین محمد اسحٰق قونیوی (م:۶۷۳ھ/ ۱۲۷۴ء) کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ وہ اصلاً ایرانی تھے۔ ایشیائے کوچک میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ ان کا حلقۂ اثر اہل تسنن سے اہل تشیع تک پھیلا ہوا تھا۔ قونیوی نے دل و جان سے ابن عربی کے افکار و تصورات کو پھیلایا۔ اس دور میں قونیوی کے ہم مشرب شعراء میں عمر بن الفارض مصری (م:۶۳۲ھ/ ۱۲۳۴ء) اور مولانا جلال الدین رومی (م: ۶۷۲ھ/ ۱۲۷۳ء) بھی ابن عربی سے متاثر ہوئے۔ رومی کی مثنوی کو 'فتوحات در فارسی' کہا جاتا ہے۔ مولانا رومی حکمۃ الاشراق کے مصنف قطب الدین شیرازی (م:۷۱۰ھ/ ۱۳۱۰ء) کے استاد تھے۔ شیرازی اور شیخ محقق طوسی (م۔ ۶۷۵ھ/ ۱۲۷۳ء) کے درمیان خط و کتابت رہتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے معترف و مداح تھے۔ اس طرح شیخ طوسی بھی ابن عربی سے متاثر ہوئے۔ دیگر شیعی شارحین و محققین میں ابن ترکہ، سید حیدر عاملی اور ابن جمہور اہم ہیں۔ ان کی بدولت ابن عربی کے افکار و تصورات شیعی فکریات میں شامل ہوئے۔ حتیٰ کہ ملاصدرا (م: ۴۴۲ھ/ ۱۰۵۰ء) نے فلسفہ و حکمت کا جزو بنادیا۔ ابن عربی کے دیگر شارحین کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ ان میں ابن الزملکانی کمال الدین (م:۷۲۷ھ/ ۱۳۲۶ء) کمال الدین عبد الرزاق الکاشانی (م:۷۳۰ھ/ ۱۳۲۹ء) شیخ داود القیصری (م:۷۵۱ھ/ ۱۳۵۰ء) بالی آفندی (م: ۷۵۴ھ/ ۱۳۵۲ء) مولانا عبد الرحمٰن جامی (م:۸۹۸ھ/ ۱۴۹۲ء) کی بدولت ابن عربی کے افکار و تصورات کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ خاص طور پر عبدالوہاب الشعری (م:۹۷۳ھ/ ۱۵۶۵ء) نے ابن عربی

کی ایسی توضیحات پیش کیں جو مصر و شام کے علاوہ ہندوستان میں بھی ہنوز مقبول ہیں۔ الہ آباد کے مشہور صوفی بزرگ شاہ محب اللہ (م:۱۰۵۸ھ/۱۶۴۸ء) نے بھی فصوص الحکم کی شرح فارسی میں لکھی جس کا اردو ترجمہ حافظ غلام مرتضیٰ نے شایع کیا۔ ان کے علاوہ جن ہندوستانی علماء و شیوخ نے فصوص الحکم پر مفید شرحیں لکھیں، ان میں سید شرف الدین دہلوی (م:۷۹۵ھ/۱۳۹۲ء) شیخ شمس الدین دہلوی (م: ۷۹۷ھ/۱۳۹۴ء) سید اشرف بن ابراہیم کچھوچھوی (م:۸۰۸ھ/۱۴۰۵ء) شیخ علاؤ الدین علی مہائمی (م:۸۳۵ھ/۱۴۳۱ء) شیخ محمد افضل الہ آبادی (م:۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء)، شیخ طاہر بن یحییٰ الہ آبادی وغیرہ کے نام خاص طور پر لیے جاسکتے ہیں۔

تصوف کو علم کا درجہ حاصل ہوا تو وحدت الوجود بھی عقیدہ کے دائرہ سے نکل کر فلسفہ کی سرحد میں داخل ہوگیا۔ ابن عربی اور ان کے متبعین نے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور عقیدۂ توحید کے افہام و تفہیم میں ایسی ایسی فلسفیانہ موشگافیاں کیں، جن کے بارے میں نہ تو قرآن میں وضاحت تھی، نہ احادیث میں۔ مثلاً کیا خدا کی صفات اس کی ذات میں داخل ہیں، یعنی عین ذات ہیں؟ یا کیا ان صفات سے خدا کی ذات جدا ہے یعنی یہ صفات غیر ذات ہیں؟ کیا یہ صفات لاعین ولاغیر ہیں، یعنی یہ صفات نہ خدا کی ذات میں داخل ہیں، نہ اس سے جدا ہیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ خدا کی ذات میں کوئی صفت ہی نہ ہو یا کیا خدا کی ذات میں خارجی یا داخلی صفات کا عقیدہ شرک نہیں ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ بحثیں صوفیہ اور متکلمین دونوں کی فکر و تحقیق کا مرکز بنی رہیں۔ متکلمین نے موقف اختیار کیا کہ خدا کی صفتیں لاعین ولاغیر ہیں یعنی یہ کہ صفات خدا نہ اس کی ذات میں داخل ہیں، نہ باہر ہیں۔ اس سے مسئلہ پیدا ہوا کہ پھر ذات خدا سے ان کے ربط کی نوعیت کیا ہے؟ اس کا تسلی بخش جواب متکلمین کے پاس نہیں تھا۔ علمائے عظام نے جن میں معتزلہ پیش پیش تھے، صفات کی نفی کر دی۔ انھوں نے توحید کی وضاحت تعقل سے کرنا شروع کی۔ اس سے ان کو 'اصحاب التوحید' کا لقب مل گیا! ان فلسفیانہ نکتہ سنجیوں کی داد دی جاسکتی ہے لیکن انھیں قرآن واحادیث کی روشنی میں سمجھنا ممکن نہیں ہو سکتا! اس لیے انھوں نے اپنی اپنی بحثوں میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے غیر اسلامی مآخذ سے مدد لی جس سے پوری بحث میں اسلامی نقطہ نظر سے ایسی کجی پیدا ہو گئی ہے کہ اس کو تاثریا بلند کرتے جایئے خشت اول کی پیدا کردہ کجی بڑھتی ہی جائے گی!

صوفیہ بھی اہل ظاہر و متکلمین کے جوابات سے مطمئن نہ ہوئے۔ انھوں نے الہامات، قیاسات اور تشبیہات کے ذریعہ ان مباحث کا جواب دینا شروع کیا۔ ابن عربی کی رمزی واشارتی زبان میں گفتگو ہوئی تو یہ دقیق مسائل مزید ناقابل فہم و تفہیم ہوگئے۔ اسلامی مباحث توحید بھی ترسیل کے المیہ کا شکار ہوگئے! یہی وہ نقطۂ انحراف ہے، جس نے تصوف میں بالعموم اور عقیدہ وحدت الوجود میں بالخصوص غیر اسلامی تصورات کی راہیں ہموار کردیں۔

علامہ اقبال کے بقول وحدت الوجود کے عناصر اربعہ: ایمان بالغیب، غیب کی جستجو، علم الغیب اور تحقیق پر غور و فکر کے لیے بعض صوفیہ اور خاص کر فرقہ نقش بندیہ نے جو دیگر ذرائع ایجاد کیے، ہندوستانی ویدانتیوں سے مستعار ہیں۔ ۷ع کنڈلینی یوگ (कुण्डलिनीयोग) کے ہندو نظریہ سے مستعار لے کر انھوں نے جسم انسانی کو مختلف رنگوں کے چھ مراکز تقسیم کردیا۔ وحدت الوجودی انھیں چھ مراکز کو مراقبہ کے چند طریقوں سے متحرک کردیتا ہے۔ پھر ان رنگوں کی ظاہری کثرت و تعداد سے اساسی نور کا عرفان حاصل کرتا ہے۔ یہ اساسی نور بے رنگ ہے، جس سے ہر چیز نظر آتی ہے اور غیر مرئی بھی ہے۔ صوفیہ نور کے چھ مراکز سے اسمائے الٰہی اور دیگر پراسرار کلمات کے ورد سے جسم کو حرکت کے ذریعہ متعین راستے پر ڈالتے ہیں، جس سے ان مراکز نور کا عرفان ہوتا ہے۔ یہی نور صوفی کے جسم کو منور کردیتا ہے۔ یہاں اس امر کی صراحت کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نظریۂ وحدت والوجود تمام تر ہندو فلسفہ کا مرہون منت نہیں ہے بلکہ، اس کے بعض پہلوؤں پر ویدانتی اثرات کی کارفرمائی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

❁ ویدانتی توحید:

'ویدانت' (वे दान्ता) سنسکرت کے دو الفاظ 'وید' (वे द) اور 'انت' (अन्त) کا مجموعہ ہے۔ ویدوں کے آخری حصہ کو ویدانت کہتے ہیں۔ ویدی ادبیات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس کا پہلا حصہ عمل سے متعلق ہے جس کو 'کرم کانڈ' (कर्मकाण्ड)، دوسرا حصہ علم سے متعلق ہے، جس کو 'گیان کانڈ' (ज्ञानकाण्ड) اور تیسرا حصہ عبادات سے متعلق ہے، جس کو 'اپاسنا کانڈ' (अपासनाकाण्ड) کہتے ہیں لیکن عام طور پر ویدی ادبیات میں 'برہمن' (ब्राहमण) ہی کو 'کرم کانڈ' کہتے ہیں کیونکہ

ان میں یگیہ (यज्ञ) کا بیان ہے۔ اپ نشدوں (उपनिषदों) کو 'گیان کانڈ' کہتے ہیں۔ ' انت ' (अन्त) کے معانی ہیں۔۔ مراد، اصول، داخلی مفہوم یا بیان ہے۔ اپ نشدوں کے مطابق دیوی دیوتا، انسان، چرند و پرند، جمادات و نباتات اور ہر خشک و تر شے 'برہم' میں شامل ہے۔ یہی 'ویدانت' کا اساسی نظریہ ہے۔ بعد کے ادوار میں 'ویدانت' سے ہندو فلسفہ کا ایک مخصوص فرقہ مراد لیا جانے لگا، جو اُپ نشدوں کی بنیاد پر محض 'برہم' کے صاحب اختیار ہونے کا قائل ہوتا ہے۔ بعض اصول مباحث میں باہمی اختلاف کی بنا پر ان کے کئی مسالک بن گئے ..... ' ادویت واد' (अद्वैतवाद) 'وششٹ دویت' (विशिष्टद्वैत) اور ' شدھ اڈویت (शुद्धवेदवाद) وغیرہ۔ صوفیہ کے حوالے سے خاص طور پر 'ادویت واد' کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو وحدت الوجود کا ہندو روپ ہے۔ ۲۸

ہندو فلسفہ میں 'ادویت' تلاش حق کا فلسفہ ہے۔ جو فلسفی حق کی وحدانیت کے قائل ہیں، 'ایک تو وادی' (एकत्ववादी) کہلاتے ہیں اور جو حق کی کثرت کے قائل ہیں، ان کو 'انیک تاوادی' (अनेकतावादी) کہتے ہیں۔ 'ادویت وادی' کہتے ہیں کہ حق، نہ وحدت ہے، نہ کثرت۔ وہ حق کو عدد یا اعداد میں محدود کرنے کے خلاف ہیں۔ 'ادیت وادیوں' کے کئی فرقے ہیں، جن میں آچاریہ شنکر کے مسلک کو خصوصی مقبولیت ہوئی۔ شنکر کا 'ادویت واد' رامانج کے 'وششٹ دویت' اور بلبھا چاریہ کے 'اشد وادویت' سے مختلف ہے۔ ان کی تفصیل پیش کرنے کا محل نہیں۔ صوفیہ مختلف ادوار میں ان تینوں مسالک سے متاثر ہوتے رہے ہیں۔ خاص طور پر شنکر کے اثرات ابتدائی دور سے نظر آتے ہیں۔ شنکر کے مطابق خارجی عالم واقعی و حقیقی وجود نہیں رکھتا بلکہ التباس محض ہے جس کی ہستی علم حاصل ہونے تک محدود ہے۔ علم سے دھوکا کھل جاتا ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ حقیقت ذاتِ واحد کا نام ہے۔ کائنات فقط وہم و گمان ہے۔ یہی وجودی وحدت ثنویت اور دوئی کے شائبہ کے بغیر شنکر کا 'ادویت واد' ہے۔ یہی تصور باریک سا نقاب ڈال کر شیخ اکبر ابن عربی کے نظریہ وحدت الوجود میں نظر آتا ہے۔ یہ نقاب ہے، کائنات کے متعلق وحدت الوجودی تصور۔ ابن عربی کائنات کو التباس نہیں قرار دیتے بلکہ التباس کی بجائے تعینات کہتے ہیں۔ 'کنڈلینی یوگ' (कुंडलिनीयोग) جسم انسانی کو چھ رنگوں کے مرکزوں میں تقسیم کیا کرتا ہے۔ شیخ اکبر ابن عربی کے نزدیک ذات باری تعالیٰ مختلف مراتب سے گذر

کر عالم ممکنات میں ظہور کرتی ہے۔ شنکر کے ادویت واد سے وحدت الوجودی تصورات کی ہم آہنگی کا سلسلہ شیخ اکبر سے قبل بھی دراز ہو چکا تھا، جن کے بعض مباحث میں بڑی یکسانیت ہے۔

تصوف 'پر ویدانتی توحیدیت' کے اثرات تیسری صدی ہجری (نویں صدی عیسوی) سے واضح ہیں، جبکہ سنسکرت سے عربی میں تراجم ہوئے۔ اس کی بہترین مثالیں 'فنا' اور 'بقا' کی اصطلاحیں ہیں، جو اسی دور میں تصوف میں داخل ہوئیں۔ ان اصطلاحات کے معانی و مفاہیم کا ذکر گذشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ فنا' اور بقا کی اصطلاحیں بالکل انھیں معنوں میں 'غیبت' اور 'حضور' اور قدرے ترمیم کے ساتھ 'جمع' اور 'تفرقہ' کے ذریعہ پیش کی گئیں۔ ان اصطلاحات سے تیسری صدی ہجری نویں صدی عیسوی سے قبل صوفیہ کے کان آشنا نہ تھے۔ شیخ ابو سعید احمد بن عیسیٰ خراز (م۔ ۲۸۸ھ/۹۰۰ء) نے 'فنا' اور 'بقا' کی اصطلاحیں، شیخ ابو عبداللہ محمد بن خفیف شیرازی (م: ۳۷۱ھ/۹۸۱ء) نے 'غیبت' اور 'حضور' کی اصطلاحیں اور شیخ ابوالعباس سیاری نے 'جمع' اور 'تفرقہ' کی اصطلاحیں رائج کیں۔ ان میں شیخ ابو سعید خراز کو اولیت حاصل ہے، جنھوں نے پہلی بار ان اصطلاحات کو جاری کیا جو بعد میں صوفیہ کے بیانِ کشف و شہود کا عام حصہ بن گئے۔

سید علی ہجویری نے شیخ ابو سعید خراز کا قول نقل کیا ہے کہ علم کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا اور اس کے سب متعلقات عارضی و فانی ہیں اور بقا کا مطلب یہ ہے کہ عقبیٰ اور جو کچھ خدا کے پاس ہے، وہی باقی ہے۔[۲۹] انھوں نے شیخ ابراہیم شیبانی کا قول بھی نقل کیا ہے کہ فنا و بقا کے علمی مراکز اخلاص اور توحید کا جاری و ساری ہونا اور بندگی میں درستی ہے۔ جو لوگ فنا و بقا میں اس کے علاوہ کچھ اور مراد لیتے ہیں وہ بے دین اور زندیق ہیں۔[۳۰] شیخ ابو الفیض ذوالنون بن ابراہیم مصری کا ایک مرید شیخ بایزید بسطامی (م: ۲۳۴ یا ۲۶۱ھ/۸۴۸ یا ۸۷۴ء) کی زیارت کی غرض سے ان کی عبادت گاہ پر پہنچا اور دروازہ پر دستک دی۔ مکان کے اندر سے شیخ بایزید بسطامی نے دریافت کیا۔ کون ہے اور کیا کام ہے؟ اس نے جواب دیا۔ شیخ بسطامی کی زیارت کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ انھوں نے جواب دیا۔ کون بایزید؟ کہاں رہتا ہے؟ مدت ہوئی، میں نے بھی اس کو تلاش کیا تھا، وہ نہ ملا۔ مرید نے واپس آکر شیخ ذوالنون مصری سے واقعہ بیان کیا تو انھوں نے فرمایا کہ میرا بھائی بایزید خدا کی طرف جانے والوں میں شامل ہو گیا۔[۳۱] شیخ شہاب

الدین سہروردی کے نزدیک فنائے مطلق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی سالک کی اپنی ہستی پر غالب ہو جائے۔ اس کو فنائے مطلق کہتے ہیں۔ اس کی دو قسمیں ہیں — فنائے ظاہر اور فنائے باطن۔ شیخ محی الدین ابن عربی نے فنا کی سات قسمیں بیان کی ہیں۔ان میں فنائے مخالفت و معاصی اور صفات حق و تعلقات وغیرہ شامل ہیں۔[۳۲] ان کی تفصیلات پیش کرنے کا محل نہیں ہے۔

تصوف پر ویدانتی توحید کے اثرات شیخ بایزید بسطامی کے حوالے سے تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ شیخ موصوف اور شیخ ابو سعید خراز ہم عصر تھے۔ان کے کشفی و شہودی مدارج بیان میں ہم آہنگی ہے۔ دونوں بزرگ ایک دوسرے کے شہود کی تائید و توثیق کرتے ہیں۔طیفوری صوفیہ کہتے ہیں کہ جب تک اپنے آپ سے رہائی نصیب نہیں ہوگی، اس کو نہیں پاؤ گے۔ مقدم کون ہے، وہ جانے ! انھیں الفاظ میں خرازی صوفیہ بھی کہتے ہیں کہ جب تک اس کو نہیں پالو گے ،اپنے سے رہائی نہیں ہوگی۔ ان دونوں میں مقدم کون ہے۔ یہ وہ جانے ! [۳۳] ان میں شیخ بایزید بسطامی کو بہ اعتبار قدامت اور بہ اعتبار حلقۂ اثر دونوں حیثیتوں سے تقدیم و ترجیح حاصل ہے۔ غالباً تصوف پر ویدانتی توحیدیت کے اثرات انھیں کے ذریعہ وارد ہوئے ہوں گے اور بعد میں تصوف میں کشف و شہود کا عام حصہ بن گئے۔ شیخ بایزید بسطامی پر ویدوانتی توحیدیت کے اثرات و تمثیلات واضح ہیں۔ان کا بیان ہے کہ ایک بار مجھے اُٹھا کر اپنے سامنے کھڑا کر لیا اور کہا۔ ابو یزید، میری مخلوق تجھے دیکھنا چاہتی ہے۔ میں نے کہا۔ اپنی وحدانیت سے مجھے زینت بخشیے ،اپنی انانیت کا لباس عطا کیجئے اور اپنی احدیت تک بلند کر دیجئے تاکہ تیری مخلوق مجھے دیکھ کر کہہ اٹھے کہ ہم نے تجھے دیکھا۔ تو وہاں ہو نہ ہو۔ [۳۴] اس بیان میں 'برہم' اور 'آتما'۔ کے ویدانتی تصورات تمثیلی و رمزیہ پیرایہ میں بیان کیے گئے ہیں۔ایک اور مثال ملاحظہ ہو: سانپ کا کینچلی سے نکل جانا ویدانتی تمثیل ہے۔ 'اُپ نشد برہد رینک' (उपनिषद्बृहदारण्यक) میں جسم و روح کا رشتہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ گویا پہاڑی کے باہر سانپ کی کینچلی اتری پڑی ہوتی ہے۔اسی طرح جسم بے جان پڑا رہتا ہے۔ غیر مادی و غیر فانی روح تو در حقیقت 'برہم' ہے یا نور حقیقی۔ [۳۵] شیخ بسطامی کا قول ہے کہ میں اپنے آپ سے اس طرح نکل گیا جس طرح سانپ اپنی کینچلی سے نکل جاتا ہے۔ پھر میں نے اپنے آپ کو محسوس کیا کہ میں ہی وہ ہوں۔[۳۶] ابو نصر سراج نے (م:۳۷۸ھ/ ۹۹۸ء) شیخ

بسطامی کے کشفی شہود انھیں کی زبانی نقل کیے ہیں۔ درگاہ بے نہایت کی سیر کے متعلق لکھتے ہیں کہ درگاہِ وحدانیت سے سیر کی ابتدا ہوئی جو ایک پرندے کی مانند ہوئی۔ اس کا جسم احدیت کا اور بازو 'دیومت' کے تھے۔ میں عالم کیف میں مسلسل دس برس تک پرواز کرتا رہا۔ حتیٰ کہ فضائے عقل میں پہنچ گیا۔ وہاں کروڑوں برس اڑتا رہا۔ وہاں سے میدان ازلیت میں پہنچ گیا۔ وہاں شجر احدیت دیکھا۔ پھر میں نے خود پر نظر کی تو معلوم ہوا کہ بس سب دھوکہ ہے!اس بیان سے شنکر کے مطابق خارجی دنیاؤں کے واقعی وحقیقی وجود کا نہ ہونا بلکہ التباس محض ہونا ثابت ہے۔ شنکر کے تصور کا دوسرا جزو کہ التباس کی ہستی علم حاصل ہونے تک محدود ہے،اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔

شیخ بسطامی کے استاذ شیخ ابو علی سندھی کا قول ہے کہ پہلے میں ایک ایسے حال میں تھا کہ وہ میری ذات سے متعلق تھا، پھر ایک ایسے حال میں آ گیا جو اس کی طرف سے تھا۔ اس سے متعلق تھا اور اس کا تھا۔ ے۳ پہلی حالت وجودِ التباس کی ہے، جو علم کے حصول سے قبل تھی۔ دوسری حالت میں حصولِ علم کے بعد التباس کا پردہ اٹھ جانے سے متعلق ہے۔ یہ صاف صاف شنکر کے وجودی توحید کا بیان ہے۔ شیخ ابو علی سندھی نومسلم سندھی صوفی تھے۔ شیخ بسطامی لکھتے ہیں کہ میں ابو علی سندھی کی صحبت میں رہا۔ میں انھیں فریضہ کی ادائیگی کی تلقین کرتا تھا اور وہ مجھے توحیدِ خالص اور حقایق کی تعلیم دیتے تھے۔ عبد الرحمٰن جامی کا بیان ہے کہ شیخ ابو علی شیخ بسطامی سے سورہ الحمد اور سورہ قل ھو اللہ سیکھتے تھے اور وہ انھیں علم فنا اور توحید کی تعلیم دیتے تھے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ شیخ ابو علی سندھی سے جس علم فنا اور توحید کی تعلیم حاصل کی، اس کے ویدانت زدہ ہونے کے امکانات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین نے بھگتی تحریک کے معنوی پہلوؤں کی روشنی میں صحیح نتائج برامد کیے ہیں :''اس کا منشا یہ ہے کہ سالک ریاض و محبت کر کے اس بہترین ہستی سے واصل ہو جائے جس کو خدا کہتے ہیں۔'' ے۳ لیکن ان اثرات سے یہ نتیجہ نکالنا، سراسر غلط اور تعصب پر مبنی ہوگا کہ وحدت الوجود کا فلسفہ غیر اسلامی عناصر کا ملغوبہ ہے۔ حقیقت بس اتنی ہے کہ نظریۂ وحدت الوجود پر ویدانتی یا دیگر غیر اسلامی تصورات کے اثرات مختلف ادوار میں متنوع انداز میں مرتب ہوتے رہے ہیں، جن کو بعض صوفیہ نے اپنی تعلیمات کو وسیع تر تناظر میں رکھتے ہوئے، اپنے طور پر اسلامی رنگ و آہنگ

عطا کر کے پیش کیا۔

❁ تصورِ اتحاد و حلول :

تصور اتحاد و حلول کی ماہیت کا جائزہ لینے سے قبل چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) کے منظر نامہ پر نظر ڈالنا ضروری ہے جس نے اس تصور کو مختلف النوع تناظر عطا کر دیا کہ اس کے اثرات تصوف کے ہر دور میں مرتب ہوتے رہے۔ اس دور کا سب سے بڑا المیہ فقہ اسلامی میں اجتہاد کا دروازہ بند ہونا تھا۔ اس دور کے علماء نے گذشتہ مسالکِ فقہ کی تقلید کو اپنا طرۂ امتیاز بنالیا۔ گذشتہ فقہاء کی عبارتیں نقل کرنے، شرح لکھنے اور کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ فروع مسائل کو جمع کر دینے پر زورِ قلم صرف ہونے لگا۔ ایسے فرضی مسائل کی فہرستیں تیار ہوئیں جو کبھی واقع نہیں ہوئے لیکن ان کے مدلل جواب لکھے گئے۔ فقہاء کے اس رویے کی دوسری تبدیلی شدید تعصب و تنگ نظری کی شکل میں رونما ہوئی، جس میں ایک مسلک کا فقیہ دوسرے مسالک کو برداشت کرنے کا تیار نہ تھا۔ اگر کوئی حنفی ہے تو اسے ہر مسئلہ میں فقط فقہ حنفی کا پابند رہنا ہوتا۔ اگر کسی اور فقہ کا پابند ہے تو بس اسی فقہ کا پابند رہنا ہوتا۔ کسی دیگر فقیہ کی جانب رجوع نہیں کر سکتا تھا۔ جبکہ قدیم میں ایسی پابندی نہیں تھی۔

صوفیہ کا معاملہ بھی مختلف نہ تھا۔ تیسری صدی ہجری (آٹھویں صدی عیسوی) سے تصوف میں ہندی یونانی اور ایرانی فلسفہ کی آمیزش شروع ہو چکی تھی۔ اس سے تصوف کی فطری و دیرینہ سادگی ختم ہو رہی تھی۔ غالباً سب سے شیخ حارث محاسبی نے تصوف میں فلسفہ داخل کیا۔ انھوں نے خواطر، وساوس اور دیگر مسائل پر گفتگو کی جو مسلمانوں کے لیے سراسر نئی تھیں۔ امام احمد بن حنبل نے ان کی شدید مخالفت کی۔ نتیجہ میں انھیں اپنی جان بچانے کے لیے روپوش ہونا پڑا اور اسی عالم میں ان کی وفات ہوئی تو نمازِ جنازہ میں صرف چار افراد شامل ہو سکے۔ حالانکہ امام غزالی نے ان کی تصانیف کو اصول اعتبار سے قابل اعتبار مانا ہے۔ لیکن ان کا قول دیگر فقہاء اور صوفیہ کے درمیان مفاہمت کی دلیل نہ بن سکا۔ اس دور میں فقہاء اور صوفیہ کے درمیان نزاع نے اتنی شدت اختیار کر لی تھی کہ دونوں دو متخاصم گروہوں کی شکل میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے آمادہ پیکار رہتے تھے۔ اصلاً دیکھا جائے تو یہ دو گروہوں کا ٹکراؤ نہ تھا بلکہ دو مختلف مکاتبِ فکر ایک دوسرے سے متحارب تھے۔ ایک طرف یہ عقیدہ

تھا کہ اعتماد، قلب، ذوق، باطن کا مدار ایسی معرفت پر مبنی ہے جو الہام سے حاصل ہو سکتی ہے۔ دوسری طرف اعتماد کا اظہار فقط کتاب وسنت پر تھا۔ وہ باطن کے قائل نہ تھے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ صوفیہ کی توجیہ روح اور نفس پر تھی، فقہاء شریعت کے ظاہری و عملی حیثیت کے علاوہ کسی اور طرف دیکھنا بھی گناہ قرار دیتے تھے۔ صوفیہ کے طبقے کو 'روحانی اور فقہاء کو' قانونی گروہ' کہا جاسکتا ہے۔ دونوں کے مقاصد عبادت مختلف تھے۔ صوفیہ کی توجہ عشق الٰہی کی جانب تھی۔ انھیں اوامر ونواہی پر ثواب وعتاب سے دلچسپی نہ تھی جبکہ فقہاء عبادت پر اس لیے زور دیتے تھے کہ ثواب حاصل ہو، گناہوں سے بچا سکے۔ ایک اور اساسی اختلاف یہ تھا کہ فقہاء خالق اور کائنات کا دو مختلف وجود مانتے تھے اور صوفیہ کے نزدیک کائنات میں خدا کے سوا کوئی اور وجود ہو تا ہی نہیں۔ لاموجو د الا اللہ ۔ یہ وحدت الوجودی نظریہ ہے ۔ تصور اتحاد وحلول کے لیے متہم شیخ عبد المغیث الحسین بن منصور (م:۳۱۰ھ / ۹۲۲ء) کے یہ اشعار ان کے موقف کی وضاحت کرتے ہیں

انامن اهدی ومن اهدی انا: نحن روحان حللنا بدلنا
فاذا بصيرت البصرتنی و اذا البصرتنی الصرتنا

(میں کس سے محبت کرتا ہوں۔ وہ کون ہے جس سے محبت کرتا ہوں۔ ہماری روحیں بدن میں حلول کر گئی ہیں۔ جب تو نے اس کو دیکھا تو مجھے کو دیکھا۔ تو نے مجھے کو دیکھا تو ہم دونوں کو دیکھا)

'اتحا' و 'حلول': دونوں زبان عربی کے الفاظ ہیں جن کو صوفیہ نے اصطلاحات کا درجہ عطا کر دیا۔ 'اتحاد' (Fusion) کا مفہوم ہے کہ خدا اور بندے کا متحد فی الذات ہو جانا۔ 'حلول' (Incarnation) سے مراد ہے کہ خدا اور انسان دونوں تحلیل ہو کر ایک ہو جائیں، جس سے ایک تیسری شے وجود میں آتی ہے۔ 'اتحاد' میں دونوں اپنی اپنی کیفیات ذاتی پر برقرار رہتے ہیں۔ سید ہجویری اور بعض دیگر صوفیہ نے ' اتحا' و 'طلول' کو کفر قرار دیا ہے۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے حلاج کے مذکورہ بالا اشعار کے بارے میں دوٹوک فتویٰ دے دیا ہے: " قارئین دھوکا نہ کھا جائیں۔ یہ وحدۃ الوجود نہیں بلکہ حلول یا اتحاد ہے۔ کیونکہ حلاج بار بار دوئی کا اعلان کر رہا ہے۔ وحدت الوجود کی رو سے دوئی محال ہے کیونکہ لا محدود فی الحقیقة الا اللہ۔ یہ کائنات اس کی تجلیات کا دوسرا نام ہے۔ دگر ہیچ۔" ۳۸

. وحدت الوجود اور اتحاد و حلول کے نظریات کے مابین خط امتیاز اتنا واضح نہیں ہے کہ ان کے متعلق آسانی سے فیصلہ کیا دیا جاسکے۔ اگر ایسا ہوتا تو صوفیہ نے منصور حلاج کو واقعہ دار کے بعد ترک کر دیا ہوتا۔ لیکن انھوں نے نہ صرف یہ کہ منصور حلاج کو شہید قرار دیا بلکہ منصور سے قبل سلطان العارفین شیخ ابویزید طیفور بن عیسیٰ بسطامی نے بھی اعلان کیا تھا: سبحانی مااعظم شانی (پاکیزہ و باعظمت میری ذات ہے) اور لیس فی جیبتی سری الله (میرے جبہ میں اللہ کا کوئی راز نہیں ہے)۔ ان نعروں پر سزا اور تادیب تو کیا، انھیں صوفیہ قلب سے لگا کر رکھتے ہیں۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے منصور حلاج کو ان کے عقاید اتحاد و حلول کی بنا پر نہیں بلکہ بعض دیگر مصلحتوں کے پیش نظر شہید کیا گیا۔ ان میں ان کا سفر قم (ایران) کلیدی اہمیت کا حامل ہے ہے۔ قم قدیم سے شیعی مرکز رہا ہے۔ اس لیے ان پر منجملہ اتہامات یہ بھی تھا کہ ان کا تعلق شیعوں کے اس گروہ سے تھا جو بنو عباس کی خلافت ختم کر کے خلافت بنی فاطمہ قائم کرنا چاہتے تھے اور یہی وہ اتہام تھا، جس کو خلیفۂ وقت مقتدر باللہ (۲۹۵-۳۲۰ھ/ ۹۰۷-۹۳۲ء) برداشت نہ کر سکا اور قاضیوں کے فتویٰ پر اس نے خود بھی توقیع لکھا... مجرم ایک ہزار درے لگائے جائیں اور اگر اس پر بھی نہ مرے تو اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر قتل کر دیا جائے اور اس کے سر کو بلندی پر نصب کر کے، اس کے جسم کو آگ میں جلا کر خاکستر کر دیا جائے۔ اس حادثۂ فاجعہ سے فقہاء اور صوفیہ کے درمیان مخالفت و نزاع کی شدت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ حالانکہ قاضی ابو عمر، قاضی ابو جعفر وغیرہ کی مجلس قضاء میں جو الزامات منصور حلاج پر واز کیے گئے تھے، انھوں نے تمام الزامات سے اپنی برأت اعلان کیا تھا۔ پھر جھوٹی شہادتوں اور قیاسات کی بناء پر اتنی بہیمانہ سزا کا اعلان کیا گیا۔ نتیجہ میں منصور کو حیات جاودانی حاصل ہو گئی البتہ ان کے حریف فقہاء و قضاۃ رسوا ہو کر رہ گئے۔

'اتحاد' و 'حلول' کے تصور کے تاریخی ارتقاء پر نگاہ کریں تو ابتداً تصوف کے دو اصولی موضوعات ہوتے تھے۔ اولاً کہ ذوق و شوق کی عبادت گذاری سے روح میں ایسے فوائد پیدا ہوتے ہیں جو غیر مادی مگر قابل ادراک حقایق پر مبنی ہوتے ہیں۔ دوئم یہ کہ 'علم القلوب' کے ذریعہ معرفتِ روح حاصل کی جاسکتی ہے جو قوت ارادی کو حصول 'فوائد' کے لیے مستعد و متحرک کرتی ہے۔ صوفیہ کے

مطابق 'علم القلوب' میں ایک قوت محرکہ موجود ہوتی ہے۔جو سفر الی اللہ کی منزلوں کی سراغ دیتی ہے۔ اس سفر کے بارہ مقامات واحوال متعین کیے گئے ہیں جن میں بعض 'فوائد' کے ذریعہ کسب کیے جاسکتے ہیں۔باقی معرفت الٰہی سے حاصل ہوتے ہیں۔پھر حالتِ وجدان میں باری تعالیٰ سے ہم کلامی کاشرف حاصل ہوتا ہے۔اس وجدانی کیفیت کا اظہار اولین صوفیائے کرام میں رابعہ، محاسبی اور یحییٰ رازی نے کیا تھا۔ لیکن بعد کے ادوار میں وجودی وحدت (Ontological Unity) اور عددی وحدت (Numerical Unity) کو باہم خلط ملط کردیا گیا۔اولین دور کے صوفیہ کے بعد متکلمین کے مابعد الطبیعی تصورات نے اپنی الجھنوں میں صوفیہ کو بھی لپیٹ لیا۔جو ہر اتفاق (Occasionalism) سے جدلیاتی مادیت (Dialectical Materialism) تک بحثیں اٹھتی رہیں۔ صوفیہ کے مسلک کرامیہ نے زور دیا کہ خلق ارواح اور نفوس میں اللہ کی ایک شان ہے۔ مسلک سالمیہ کے نزدیک شور وشوق کی حامل ارواح کا حضور باری تعالیٰ سے واصل ہونا ممکن ہے اور فرقہ حلاجیہ کے صوفی مخاطبت الٰہی سے جو حالت وجد میں پیدا ہوتی ہے، نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اولیاء کی شکل میں زندہ شواہد پیدا کیے ہیں۔اس عقیدہ کا ایک پہلو طبقاتِ رجال الغیب کے نظریہ سے وابستہ ہے۔ اس کا دوسرا پہلو کفر والحاد کے الزام کی صورت میں سامنے آتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ انسان کا جسم فانی بھی الٰہیت پر غاصبانہ قبضہ کر سکتا ہے کیونکہ دو مختلف ذاتیں بیک وقت ایک ہی مکان پر قابض نہیں ہو سکتی ہے۔ چوتھی۔ صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) میں یہ مسئلہ اور بھی الجھ گیا کیونکہ روح، اور نفس سے متعلق جو اصطلاحیں وضع کی گئیں، وہ افلاطون کے فلسفہ عینیت (Idealism) اور فلوطینس کے نظریۂ اضافی (Emanation) سے خلط ملط ہو گئیں، جس نے نظریۂ اتحاد وحلول کو مزید پراسرار بنادیا۔اس دور کے اکثر و بیشتر مشائخ صوفیہ عالم تذبذب میں نظر آتے ہیں کہ ذیل کی تینوں تشریحات میں سے کس تشریح کو درست قرار دے کر قبول کریں:۳۹ع

(الف) اتحادیہ: ان کے نزدیک نفسِ منفعل سے عقلِ فعال کی تاثیر سے معانی کی تشکیل کو اتحاد کہتے ہیں اور عقلِ فعالی فیضِ الٰہی کا عطیہ الٰہی ہے اور فیضِ الٰہی ہی نورِ محمدی ہے۔ یہ تصور قرامطہ

اور سالمیہ کے علاوہ ابن مسرہ سے اخوان الصفا سے فارابی اور ابن قیس تک مروج رہا ہے۔

(ب) اشراقیہ: ان کے نزدیک روح نور ایزدی کا شرارہ ہے جو زندگی کو عقلِ فعال کے اشراقات سے منور کرتی ہے۔ یہ تصور سہروردی، حبلی اور جندکی سے دوّانی اور صدرالدین شیرازی تک پھیلا ہوا ہے۔

(ج) وصولیہ: ان کے نزدیک روح کو ذاتِ الٰہی سے موافقت حاصل ہو جاتی ہے، پھر ایسے وجود و جامع کا شعور پیدا ہو جاتا ہے جس میں تعدد یا امتیاز باقی نہیں رہتا۔ یہ تصور ابن سینا سے ابن طفیل اور ابن سبعین تک محیط ہے۔ ابن سینا نے اولاً اسے نجات قرار دیا تھا۔[40] لیکن بعد میں اس کو رد کر دیا تھا۔[41] امام غزالی نے بھی اس تصور کی تردید کی ہے۔[42] البتہ ابن سبعین، جو نظریہ قدم پر راسخ العقیدہ رہا، ذات باری تعالیٰ میں مخلوقات کی صورت یا ان کے اصول تفرد کے علاوہ کسی دیگر وجود کا قائل نہیں رہا۔

علامہ اقبال نے منصور حلاج کے نظریہ کا تجزیہ کرتے ہوئے واضح موقف اختیار کیا ہے۔ اس کے مآخذ کے متعلق دوٹوک باتیں کہی ہیں۔ ان کے نزدیک صوفیہ جس انتہائی حقیقت کو 'حسنِ ازل' سمجھتے ہیں، اس کے خمیر میں داخل ہے کہ 'چہرے' کو کائنات کے آئینہ میں منعکس کرے۔ یہ نظریہ براہ راست غیر شخصی جذب کی صورت میں برآمد ہوا، جو اولاً شیخ بسطامی میں کی شخصیت کا جزو بنا۔ عین ممکن ہے کہ اس تصور پر ان ہندو زائرین کا اثر پڑا ہو، جو ایران کی راہ میں سے بدھی مندروں کی زیارت کو جانا کرتے تھے اور جو اس وقت باکو میں موجود تھے۔ منصور حلاج نے ہندوستان کا سفر بھی کیا تھا۔ ان پر اس کے اثرات زیادہ ہی مرتب ہوئے۔ انھوں نے اس تصور کو خالص وحدت الوجودی بنا دیا اور سچے ہندو ویدانتی کی طرح انا الحق (अहम ब्रह्म इस्मी) کا نعرہ لگا دیا۔[43] اس نعرہ کا علامہ اقبال پر بھی، جو اپنے برہمن نژاد ہونے پر افتخار کرتے تھے، گہرے باطنی اثرات تھے۔ ممتاز فرانسیسی مستشرق لوئی میسنن نے، جس کو حلاجیت پر اسناد کا درجہ حاصل ہے، علامہ اقبال سے پیرس میں (۱۹۲۲ء میں) ملاقات کی تھی۔ اس کے نزدیک نطشے بھی منصور کے انا الحق سے متاثر تھا۔[44] علامہ اقبال نے 'جاوید نامہ' اور 'اسرار خودی' میں شیخ منصور حلاج کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ فارسی کے صوفی شعراء میں ابو سعید ابوالخیر، عطار، شبستری، حافظ، عثمان ہارونی، جامی وغیرہ نے بھی حلاج سے تاثرات حاصل کیے ہیں۔ ان

کے کلام میں حلاجیت کی نشان دہی کئی ناقدین نے کی ہے۔

شیخ منصور حلاج کو بین الاقوامی شہرت ودوامیت حاصل ہے۔استنبول کی مائیں منصور کے نام پر لوریاں سناکر اپنے بچوں کو چپ کراتی ہیں۔ لبنان کے علاقہ دروز میں منصور کے قصے بیان کرنے کارواج ہے۔دمشق کے تہلجی اپنے نغموں میں منصور کاذکر کرتے ہیں۔ملیشیا کے صوفیہ بھی اناالحق کے تصور سے متاثر ہیں۔دنیا کے مختلف علاقوں میں منصور کو مقامی رنگ وآہنگ کے اعتبار سے پیش کیا جاتا ہے۔ حلاجیت کی ماہر لوئس مسینن لکھا ہے کہ ہندوستانی مسلم حکمرانوں میں سلطان التمش (۳۵-۱۲۱۰ء) حلاجیوں کابڑاقدرداں تھا۔سلطان فیروز شاہ تغلق (۸۸-۱۳۵۱ء) کاایک امیر عین مہرو بھی اناالحق کانعرہ بلند کرتا تھااور اس کے متوسلین آمین کہتے تھے !۴۳؎ گجرات پر حلاج کے اثرات کی نشان دہی ۴۴-۱۳۴۳ء سے کی جاتی ہے۔ہندوپاک میں اکثر نومسلم بنیے، دھنیا ور نداف اپنے ناموں کے ساتھ 'منصوری' لکھتے ہیں۔بنگلہ دیش کے ڈھاکہ اور چٹگانگ اور ہندوستان کے اڑیسہ (مربھنگ) میں ستیہ پیر کا تصور بھی منصور حلاج کامرہونِ منت ہے۔ تمل ناڈ کے پورٹونوامیں حلاجیوں کافرقہ آباد ہے۔ بعض مصوروں نے بھی حلاج کو مسیح کاہم پلہ بناکر پیش کیا ہے۔ ۴۵؎

شیخ منصور حلاج کے زیراثردیگر صوفیہ اپنے تصورات کودارورسن کی پرواکیے بغیر پیش کرتے رہے ہیں۔ان میں کئی صوفیہ شہادت کے درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔ان میں حکمۃ الاشراق کے مصنف شیخ ابو المعالی بن عبد اللہ بن ابو بکر ، شیخ محمد بن الحسن بن علی المیانجی معروف بہ عین القضاۃ (م:۵۲۶ھ/۱۱۳۱ء) اور شیخ سرمد (م:۱۰۷۱ھ/۱۶۶۰ء) کے نام خاص طور پر لیے جاسکتے ہیں۔ آخر الذکر بحکم اورنگ عالم گیر شہید کیے گئے اور دہلی جامع مسجد کے دروازہ کے قریب مدفون ہیں۔

❁ وحدۃ الشہود :

اس نظریہ کے موسس شیخ علاؤالدولہ سمنانی (م:۷۳۶ھ/۱۳۳۶ء) ہیں جو سلسلہ کبرویہ کے ایرانی صوفی بزرگ ہیں۔انھوں نے ابن عربی کے نظریۂ وحدت الوجود کے مدمقابل نظریۂ وحدت الشہود پیش کیا۔اس کے دواہم اسباب تھے۔اولاً یہ کہ عصری حکمرانوں کی سیاسی حکمت عملی کو دینی بنیاد اور تقدس عطا کرنا۔جس کے تحت بدھوں کو نیست ونابود کیا جاسکے کیونکہ وحدت الوجود کے مباحث میں

بودھیت کے لیے گنجائش پیدا ہوتی تھی۔ ثانیاً یہ کہ صوفیہ اور شیعی عقائد کی مشترک بنیادوں کو منہدم کرنا کیونکہ ان کے نزدیک صوفیہ اور شیعی عقائد کی مشترک بنیادیں' وسیع تر معاملات میں ابن عربی کے تصورات اور شیعی تصورات میں ہم آہنگی اور مطابقت کے سبب ،اہل تسنن کے لیے خطرہ کی علامت تھیں۔ تاآنکہ کریلا نیم چڑھ گیا.... غزنی کا ولی عہد المتیو (۱۶۔ ۷۰۴ھ/ ۱۶۔ ۱۳۰۴ء) شیعہ ہو گیا۔ شیخ علاؤالدین سمنانی کے لیے شیعیت کا فروغ پانا کسی طرح قابل برداشت نہ تھا۔ ۶۴ غالباً یہی وہ قدر مشترک تھی، جس نے شیخ احمد سرہندی کو ہندوستان میں وحدت الشہود کا علم بلند کرنے کی جانب مائل کیا۔

شیخ احمد سرہندی (م: ۱۶۲۴ء) مجدد الف ثانی کے لقب سے مشہور و معروف ہیں۔ لیکن مجددیت کے اولین مدعی علامہ جلال الدین سیوطی ہیں، جنھوں نے ہر صدی میں ایک مجدد کے ہونے کا تصور پیش کیا۔ لیکن شیخ احمد سرہندی طبعاً و خلقاً تجدد پسند تھے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ان کا شمار مجدد دین ملت میں کیا ہے۔ ۷۴ البتہ مولانا سید احمد عروج قادری کے نزدیک شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کا نظریہ قیومیت "افترا علی اللہ کی وہ قسم ہے، جس سے مشرکین عرب بھی واقف نہ تھے۔" ۸۴ شیخ عبد الحق محدث دہلوی (م: ۱۰۵۲ھ/ ۱۶۴۲ء) شیخ مجدد الف ثانی کے ہم مسلک تھے لیکن ان کے نظریۂ قیومیت کے شدید مخالف تھے۔ انھوں نے شیخ موصوف کو ایک طویل مکتوب لکھ کر صحیح صورت حال واضح کر دی ہے کہ جبتک شیخ مجدد الف ثانی بزرگان دین میں شیخ جنید بغدادی، شیخ بسطامی' شیخ عبد القادر جیلانی یا اپنے استاذ و پیر شیخ باقی باللہ پر اپنی فضیلت و فوقیت کا دعویٰ کرتے رہے، شیخ عبد الحق محدث دہلوی قلب پر جبر کیے خاموش رہے لیکن جب شیخ مجدد الف ثانی نے پیغمبر اسلام کی ہم سری کا دعویٰ کر دیا، تو شیخ محدث دہلوی کے ہاتھوں سے صبر کا دامن چھوٹ گیا اور ان کو متنبہ کرنا ضروری قرار دیا۔ ۹۴

نظریہ وحدت الشہود شدید طور پر متنازع فیہ رہا ہے۔ اس کو جمہور صوفیہ نے کبھی قبول نہیں کیا۔ نظریۂ وحدت الشہود کی تائید یا تردید میں صوفیہ قلم آزمائی کرتے رہے ہیں۔ شیخ ولی اللہ محدث دہلوی (م: ۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۲ء) بھی شیخ مجدد کے خیالات سے اختلاف کرتے تھے۔ انھوں نے ایک رسالہ

'فیصلہ وحدت الوجود والشہود تحریر کیا۔ لیکن شیخ مجدد کے ایک صدی بعد خواجہ ناصر عندلیب (م۔۱۱۷۲ھ /۱۷۵۸ء) نے اپنی کتاب نالہ عندلیب میں اور ان کے فرزند خواجہ میر درد (م۔۱۱۹۹ھ /۱۷۸۵ء) نے اپنی کتاب واردات میں شیخ مجدد کے موقف کی تائید کی۔ انھوں نے خاص طور پر وحدت الوجودی اصطلاحات پر اعتراض کیا اور طریقت کو شریعت کا پابند قرار دیا۔ عقیدہ وحدت الوجود کے خلاف ایک اور رسالہ الفرع الثابت من اہل الثابت بھی ہے۔ جس کے مصنف میر محمد یوسف بلگرامی (م:۱۱۶۵ھ / ۱۷۵۱ء) ہیں۔ اس کا ایک نسخہ آزاد لائبریری علی گڑھ کے شعبۂ سبحان اللہ میں موجود ہے۔ اسی طرح ایک اور کتاب مولوی غلام یحیٰ (م:۱۱۹۵ھ / ۱۷۸۰ء) کلمات الحق ہے، جو شیخ ولی اللہ دہلوی کے موقف کی تردید میں لکھی گئی اور ثابت کیا گیا ہے کہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود دو مختلف و متضاد نظریات ہیں۔ ان میں تطبیق ممکن نہیں ہو سکتی۔ اس کے جواب میں شاہ رفیع الدین (م: ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۳ء) نے دمغ الباطل لکھی، جس میں شاہ ولی اللہ کے موقف کی تائید کی گئی۔ اس تائید و تردید کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ علامہ اقبال بھی وحدت الوجود کے معترضین میں شامل ہیں۔

ان تائید و تردید رد عمل کی تصانیف سے قطع نظر وحدت الشہود کے وحدت الوجود کا رد عمل ہونے سے کون انکار کرے گا۔ شیخ احمد سرہندی نے شیخ اکبر ابن عربی کی تردید میں اساسی نکتہ پیدا کیا کہ اللہ تعالیٰ کسی شے سے متحد نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ابن عربی کے تصور کو سہو قرار دیا کہ ان سے 'خطائے کشفی' سرزد ہو گیا۔ شیخ احمد سرہندی کا دعویٰ ہے کی ابن عربی نے تجلی ذاتی کے مقام پر ذاتِ احدیت کو بے نقاب دیکھا تو ان کی تمام تر توجہ ذات احدیت پر مرکوز ہو گئی، جس سے انھیں ماسوا سے نسیان کلی ہو گیا۔ ابن عربی کی خطائے کشفی تھی کہ اس مقام پر رک گئے، ورنہ کشف میں مزید ترقی کرتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اشیاء سے ماوراء ہے۔

شیخ احمد سرہندی کا وحدت الشہودی کشف تین مراتب سے گزر کر وحدت الوجود کی نفی پر اختتام پذیر ہوتا ہے جو ابن عربی کے چھ تنزلات سے بظاہر مختلف و متضاد ہیں لیکن اصلاً ان سے مستعار و متاثر ہیں۔ شیخ احمد سرہندی نے ان وحدت الشہودی کشف کی ترتیب یوں رکھی ہے کہ... پہلے مرتبہ میں وجودی وحدت کا شعور حاصل ہوتا ہے، دوسرے مرحلے میں کائنات اظلال کی ظلیت کا اور تیسری

منزل میں عبدیت کا کشف حاصل ہوتا ہے۔ شیخ احمد سرہندی کے نزدیک دوسرے مرحلے سے وجودی وحدت کا تصور ختم ہو جاتا ہے اور بندہ کو خالق اور مخلوق کے فرق کا احساس ہونے لگتا ہے لیکن آخری منزل عبدیت تک رسائی ہونے کے بعد خالق و مخلوق کے فرق کا احساس یقین میں تبدیل ہو جاتا ہے کہ رب اور بندہ کا وجود الگ الگ ہے۔

شیخ احمد سرہندی عقیدۂ وحدت الوجود کو کفر والحاد قرار دیتے ہیں: ان کا مشہور مقولہ ہے۔ ان الله وراء الوراءَ ثم وراء الوراء۔ وہ ایمان بالغیب پر زور دیتے ہیں اور کائنات کو خدا کا ظل قرار دینے کے خلاف ہیں۔ تصور وحدت الشہود کو تصور وحدت الوجود کے مقابلہ میں شرعاً پایہ اعتبار قرار دیا جاتا ہے۔ شیخ احمد سرہندی نے دین کو دو حصوں میں تقسیم کیا احکام شرعیہ اور امور دینیہ۔ ان میں احکام شرعیہ ظاہر سے متعلق ہیں اور امور دینیہ باطن سے متعلق۔ دوسری جگہ یہی تقسیم علم الاحکام اور علم الاسرار کی اصطلاحات کے ذریعہ کی ہے۔ انھیں کے الفاظ ملاحظہ ہوں: ''احکام شرعیہ مربوط بادلۂ اربعہ امت کہ الہام را در آن گنجائش نیست اما امور دینیہ ماورائے احکام شرعیہ بسیار است کہ اصل خامس در آں الہام بلکہ تواں گفت کہ اصل ثالث الہام است بعد کتاب و سنت ایں اصل تا انقراض عالم برپا است۔'' ۵۰ یعنی احکام شرعیہ چار دلیلوں کے ساتھ مربوط ہیں، جس میں الہام کی گنجائش نہیں لیکن اور دینیہ، احکام شرعیہ کے علاوہ بہت کچھ ہے، جن کی پانچویں اصل الہام ہے بلکہ کہنا چاہئے کہ کتاب سنت کے بعد الہام کو تیسرے اصل کی حیثیت حاصل ہے۔ یہی اصل قیامت تک باقی رہے گی۔ جمہور اسلام کے چار دلائل شرعی--- کتاب، سنت اتباع اور قیاس کے بعد پانچویں دلیل حجت الہام ہے اور یہی اصل ہے جو قیامت تک باقی رہے گی۔ اسی دینی تیاپانچہ پر مفصل گفتگو ہمارے حیطہ عمل کے باہر ہے لیکن اتنا عرض کرنا بیجانہ ہوگا کہ دین اسلام کو ظاہر و باطن یا احکام و اسرار کے دو متضاد خانوں میں تقسیم کرنے میں کوئی دلیل قرآن حکیم سے نہیں دی جاسکتی۔ سید علی ہجویری کا قول ہے کہ ظاہر میں انسان سے جو کچھ ظہور میں آتا ہے، وہ اس کے باطن ہی کا مظہر اور عکس ہوتا ہے۔ اگر ظاہر میں خداوند تعالیٰ کے فرمان کی تعظیم اور فرمان برداری نہیں ہے تو باطن میں حق تعالیٰ کی معرفت اور طریقت کا دعوا بے بنیاد ہے۔ ۵۱

شیخ احمد سرہندی کے وحدت الشہود کی اساس الہام اور قیومیت ہے۔ انھوں نے الہام کو معرفت الٰہی کی علت قرار دیا ہے حالانکہ الہام معرفت کی دلیل (برہان) ہے۔ اہل الہام غلط یا صحیح الہام کے لیے دلیل نہیں دے سکتے۔ سید علی ہجویری نے واضح کر دیا ہے کہ معرفت الٰہی الہامی نہیں ہو سکتی۔ معرفت میں الہام کا حکم بہ ہمہ وجوہ باطل ہے۔ ۵۳ اسی طرح وحدت الشہود کی دیگر اساس قیومیت ہے جو علماء وصوفیہ کا بلند ترین منصب ہے۔ شیخ احمد سرہندی کے الفاظ میں: ''معاملہ انسان بجایی می رسد کہ او را قیوم جمیع اشیاء بحکم خلافت می سازند وہمہ را افاضہ موجود وبقائے سائر کمالات ظاہری و باطنی بتوسط او رسانند اگر ملک ست باد متوسل است واگر جن وانس است باد متثبت و فی الحقیقت توجہ جمیع اشیاء بجانب او است وہمہ نگران او اند۔'' ۵۴ یعنی انسان کامل کا معاملہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے کہ بحکم خلافت اس کو تمام اشیاء کا قیوم بنا دیتے ہیں اور سب کو وجود کا فیض اور تمام ظاہری و باطنی کمالات کی بقا اسی کی توسط سے پہنچاتے ہیں۔ اگر فرشتہ ہے تو اسی سے متوسل ہے اور اگر جن وانس ہے تو اسی کا دامن تھامے ہوئے ہے اور فی الحقیقت تمام اشیاء کی توجہ اسی کی طرف ہے اور سب اسی کو دیکھ رہے ہیں۔ شیخ احمد سرہندی نے اپنے تصور 'قیومیت' کو اپنا 'زعم' قرار دیا ہے۔ بلاشبہ ان کے زعم کی تائید قران سے نہیں ہوتی۔ سیرت نبوی سے بھی کوئی دلیل پیش نہیں کی جا سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تصور قیومیت اصلاً تصور مہدیت کا دوسرا نام ہے جس کو جمہور علماء وصوفیہ قبول نہیں کرتے۔

شیخ احمد سرہندی کے تصور مہدیت کی بنا پر جہاں گیر ان کا دشمن بنا اور اپنی 'توزک' میں ان کے لیے بدترین الفاظ کا استعمال کیا۔ ڈاکٹر بینی پرشاد کے مترجم رحم علی الہاشمی کے الفاظ میں: ''۱۶۱۹ء میں جہاں گیر نے ایک مشہور مسلم مبلغ شیخ احمد سرہندی کو اپنے دربار میں طلب کیا جس نے مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا تھا اور جس کے لیے مسلمان ایک ہزار سال گذرنے پر منتظر تھے اور جس نے مذہب اور عبادات کا انوکھا طریقہ رائج کیا تھا۔ جہاں گیر نے باوجود اس کی جہالت کے اسے مغرور اور خود پسند پایا۔ اس کی کتاب مکتوبات جہاں گیر کے نزدیک لغویات کا طومار تھی جس میں بہت سی غیر نفع بخش باتیں تھیں جو لوگوں کو بے وفائی اور لادینی کی طرف لے جانے والی تھیں۔ غریب شیخ کو اپنی رائے دلانی کے حوالہ کیا گیا کہ اس قلعہ گوالیر میں قید رکھے جو عموماً سیاسی قیدیوں کے لیے تھا۔ شاید

جہاں گیر کو اس شیخ کے متعلق اندیشہ تھا کہ اس کی تعلیمات کی اشاعت سے مشکلات پیدا ہوں گی لیکن دو سال بعد جب اس نے پشیمانی ظاہر کی اور وفاداری کا اقرار کیا تو نہ صرف اسے رہا کیا گیا بلکہ خلعت بھی دی گئی اور کئی دفعہ معقول رقمیں بھی دی گئیں۔''۵۴

شیخ احمد سرہندی شدید نفسیاتی احساسات میں مبتلا تھے، جو دیگر اولیا سے برتری سے اور (نعوذ باللہ) رسالت مآب سے ہم سری کی شکل میں رونما ہوا۔ انھوں نے تصوف کی مروجہ اصطلاحات کی جگہ پر بعض تجدد آمیز اصطلاحات رائج کرنے کوشش کی جن میں خاص طور پر وحدت الوجود کی بجائے 'وحدت الشہود' اور 'غوثیت' کی بجائے 'قیومیت' کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کو راہ سلوک کے پہلے مرحلے کا مسافر قرار دیا کہ ذات احدیت کو بے نقاب دیکھ کر مبہوت ہو گئے اور اسی کو اصل منزل سمجھ بیٹھے حالانکہ ہر سفر کی آخری منزل میں عبد و معبود کے الگ الگ وجود کا عرفان ہوتا ہے، جس پر بقول ہے خود شیخ احمد سرہندی فائز تھے۔۵۵ انھوں نے ابن عربی کی راہ طریقت کو کفر و زندیق بتایا اور اپنی راہ طریقت کو عین اسلام قرار دیا۔ اس انداز نظر نے طریقت کو شریعت کا پابند بنا دیا۔ جس سے کہ علماء میں خصوصی مقبولیت حاصل ہوئی کیونکہ اس کے ذریعہ شریعت ظاہری کو بالادستی حاصل ہوئی لیکن اہل شریعت نے اسی سختی کے ساتھ ان کے نظریہ وحدت الشہود کا ابطال کیا۔ دور حاضر کے مشہور فقیہ مولانا اشرف علی تھانوی جو اپنے مسلک میں شیخ احمد سرہندی کے ہم نوا تھے، نظریہ وحدت الوجود کی بجائے وحدت الوجد کے قائل تھے اور اس کے دفاع میں زور قلم صرف کرتے رہے۔

'وحدت الشہود' کو ہندوستان میں مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ ہندوستان میں صوفیہ کے بارہ سلاسل میں محض ایک سلسلہ نقش بندیہ اور بالخصوص اس کے ضمنی سلسلہ نقش بندیہ مجددیہ میں مقبولیت حاصل ہو سکی۔ باقی تمام سلاسل وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ وحدت الشہودی خانقاہیں امتداد زمانہ سے تباہ و برباد ہو چکی ہیں۔ ان کے صوفیہ کے مزارات بھی بے چراغ رہتے ہیں۔ البتہ وحدت الوجودی خانقاہیں اپنی رونق و مقبولیت میں روز افزوں ہیں۔ ان کے مزارات مرجع خاص و عام ہیں۔ ہر سال بلاامتیاز مذہب و ہندوستان اور بیرونجات سے لاکھوں زائرین شرف زیارات حاصل کرتے ہیں۔ مجموعی اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ تحریک تصوف بنیادی طور پر آزاد خیالی وسیع المشربی اور انسان

دوستی کی تحریک ہے۔ اس کو نظریہ وحدت الشہود نے سنگلاخ بنیاد پرستی کے قیود میں پابند کرنے کی کوشش کی، جس سے اسلام کی ہمہ گیری مقبولیت پر ضرب پڑتی ہے۔

❁ تصور حقیقت نور :

تصوف میں تصور نور کو اساسی اہمیت حاصل ہے جس کو فلسفہ الاشراق کہا جاتا ہے۔ اس کا استنباط قرآن مجید سے کرتے ہیں۔ چند آیات کریمہ ملاحظہ ہوں: الله نور السموات والارض (اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے: النور ۳۵/۲۴) ور اعلی نور یهدی الله لنوره (یہ نور بالائے نور ہے اور اللہ اپنے نور کے ہے جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ النور ۳۵/۲۴) ومن لم یجعل الله به نوراً فما له من نورٍ (اور جس کے لیے خدا نور نہ قرار دے، اس کے لیے کوئی نور نہیں ہے۔ النور ۴۰/۲۴) واشرقت الارض بنورربها (اور زمیں اپنے رب کے نور سے جگمگا اٹھے گی: الزمر ۶۹/۳۹) ولاالظلمت و لا النور (اور تاریکیاں اور نور دونوں برابر نہیں ہو سکتے: فاطر ۲۰/۳۵) الله نور وکتب مبین، (تمہارے پاس خدا کی طرف سے نور اور روشن کتاب آچکی ہے: المائدہ ۱۵/۵) وجعل الظلمت والنور (اور تاریکیوں اور نور کو مقرر کیا ہے: الانعام ۱۵/۱۶)

مذکورہ بالا آیات کریمہ کی روشنی میں حسب ذیل نتائج برآمد کیے جاسکتے ہیں:

اولاً یہ کہ حقیقتِ مطلقہ نور ہے اور مادہ لانور ہے۔

ثانیاً یہ کہ یہ نور بالائے نور ہے، جو بندوں کو ہدایت عطا کرتا ہے۔

ثالثاً یہ کہ اگر خدا نور عطا نہ کرے تو کسی اور ذریعہ سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

رابعاً یہ کہ کائنات کا ہر زرہ خدا کے نور سے جگمگاتا ہے۔

خامساً یہ کہ نور و ظلمت دونوں برابر نہیں ہو سکتے کیونکہ دونوں کو اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا ہے۔

سادساً یہ کہ نور کے مصداق ذات باری تعالیٰ کے ماورا بھی ہیں۔ بعضوں نے مذکورہ بالا آیت مائدہ سے مراد اسلام بعض نے رسول اسلام اور بعض نے اس میں ائمہ اہلبیت کو شامل کیا ہے۔

فلسفہ الاشراق کے موسس شیخ شہاب الدین سہروردی (م: ۶۳۳ھ/ ۱۲۳۵ء) ہیں، جو سلطان صلاح الدین ایوبی کے حکم سے علمائے حلب کی فتویٰ پر شہید کیے گئے۔ ناموں کی مماثلت کی بنا پر

انھیں موسس سلسلہ سہروردیہ سے مخلوط کرنا چاہئے۔ ”فلسفہ الاشراق‘ جس کی قیمت شیخ شہاب الدین نے اپنے خون ناحق سے دی تھی، ہنوز تابندہ ہے۔ البتہ قاتلوں کے نام و نشان مٹ گئے۔ یہ فلسفہ متعدد جہات کا حامل ہے۔ اگر ایک طرف اس تصور کے مطابق خدا کا وجود کائنات کے ہر ذرہ میں ہے، جس کی بنا پر ان کو ہمہ اوست کا قائل قرار دیا جا سکتا ہے تو دوسری طرف ان کے تصورات راسخ العقیدہ متکلم سے ہم آہنگ ہیں کہ ہر ایک مظہر کی انتہائی علت نورِ مطلق میں مضمر ہے۔ اس تصور کے نفسیاتی مباحث ابو علی حسین بن عبداللہ ابن سینا (م: ۴۲۹ھ / ۱۰۳۷ء) کے تصورات سے مطابقت رکھتے ہیں لیکن اس میں ان کا رویہ تقلیدی نہیں بلکہ تجربی نوعیت کا حامل ہے۔ وہ اخلاقی فلسفہ کے بعض مسائل میں ارسطو کا ہم نوا ہیں، جس کے نظریہ وسیلہ کی جامع تشریح و توضیح کرتے ہیں۔ انھوں نے روایتی فلاطونیت کو قدیم ایرانی ثنویت سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ ان ایرانی صوفی شہید کی خصوصیت ہے کہ عام فلاسفہ کے بر عکس، جو وجود خارجی کے مختلف پہلوؤں کی توجیہ کرتے ہیں، تجربی عمل کو اہمیت دیتے ہیں۔ طبعی مظاہر کی وضاحت اپنے تصور حقیقت نور کی روشنی میں کرتے ہیں، جس سے خارجی مظاہر جو وحدت الوجود کی انتہائی باطنیت میں دب گئے تھے، مستقل فلسفیانہ نظام فکر کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ان میں فکر و جذبہ کا مکمل اتحاد و توافق ہے، جو نفوس انسانی کو ہمیشہ متحرک کرتا رہے گا۔

تصور حقیقت نور کا اساسی نکتہ ہے کہ تمام موجودات کی انتہائی حقیقت نور الٰہی ہے [۵۶]۔ نور مطلق کی ماہیت میں تجلی داخل ہے۔ نور مرئی ہے بلکہ اس سے زیادہ کوئی شے مرئی نہیں ہو سکتی اور مرئیت کی تعریف ممکن نہیں۔ ظہور ایک ایسی صفت ہے، جو نور پر اضافہ کی گئی ہے، اس کی اساسی صفت نہیں ہے۔ چونکہ نور بذاتہٖ مرئی نہیں ہے۔ اس لیے کسی مرئی شے کے ذریعہ مرئی نظر آنے لگتا ہے۔ لیکن نور اولی کے وجود کی علت نور اولیٰ سے باہر نہیں ہے۔ نور اولیٰ کے امکانات لامحدود ہیں، جس میں کائنات اپنی کثرت و تعدد کے باوصف اس لامحدودیت کا جزدی مظہر ہے۔ نور اولیٰ ان اشیاء کو منور کرتا ہے جو لانور ہیں۔ نور اولیٰ کی تجلیات کو نور مجرد اور نور عارضی میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ نور مجرد، یعنی انفرادی و کلی عقل۔ اس نور کی کوئی شکل نہیں ہوتی۔ یہ اپنی ذات کے علاوہ کسی اور ذات کی صفت نہیں بنتی۔ نور مجرد خود اپنے ذریعہ اپنی معرفت حاصل کرتا ہے۔ اس میں نور الٰہی کی غیر واضح شبیہ ہوتی

ہے۔ یہ اپنے ماخذ سے جسی قدر دور یا قریب ہوتا ہے، اسی قدر تجلی کم یا زیادہ ہوتی ہے۔ اسی طرح نور عارضی یعنی صفت کا معاملہ ہے اس نور کی اپنی شکل ہوتی ہے، جو اپنے علاوہ کسی اور شے کی صفت بن سکتی ہے۔ مثلاً ستاروں کا نور یا دیگر اجسام کی مرئیت۔ نور عارضی کو نور محسوس بھی کہہ سکتے ہیں، جو نور مجرد کی دوری کی شبیہ ہوتا ہے اور اسی دوری کی بنا پر اپنی شدت کھو دیتا ہے۔ یہ اس حد تک مدہم ہو جاتا ہے کہ کسی دوسری شے کی مدد کے بغیر نظر نہیں آتا۔

تصورِ تجلی میں کونیات کو 'لانور' کہتے ہیں۔ یہ اثبات نور کا دوسرا پہلو ہے۔ کونیات کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اولاً وہ کہ ماورائے مکان ہیں، یعنی جزو کے متعلق معلوم نہیں۔ ثانیاً وہ کہ جو موجود فی المکان ہیں۔ یعنی ظلمت، وزن، بو، ذائقہ وغیرہ۔ علامہ اقبال نے کا خیال ہے کہ لامحدود تجلیات اور نور اولی کی شعاعوں کا اشیاء میں، ان تجلیات کی وجہ سے، جن کی طرف یہ مسلسل حرکت کرتی ہیں، ایک عشق کا جذبہ ابھرتا ہے تا کہ وہ اصلی مبدائے نور سے مستفیض ہوتی رہیں۔ کائنات محبت ایک ابدی ڈراما ہے۔ ۵۷

شیخ سہروردی نے دقیق النظر فلسفی کی طرح تصور حقیقت نور کو نئے نظام فکر کی حیثیت عطا کی۔ انھوں نے مروجہ اصول و نظریات کا ناقدانہ جائزہ لیا۔ یونانی فلاسفہ، جس نے عصری اسلامی فکریات پر اپنے پنجے جمادئے تھے، ان کی خصوصی توجہ کا باعث بنا۔ انھوں نے اپنی ایک کتاب کشف النصائح الیونانیہ میں یونانی فلسفہ پر آزادانہ تنقید کی ہے اور اس کا ابطال کر کے خالص عقل کی بیچارگی ثابت کی ہے۔ جس کی بنا پر ایک طرز اشاعرہ کی تصوریت وجود میں آسکی تو دوسری طرف ایرانی تفکر کی تشکیل جدید ممکن ہو سکی۔ مجوسیوں کا یہ خیال کہ نور و ظلمت دو مختلف و متضاد حقائق ہیں یا ایران کے قدیم فلاسفہ اور زردشتیوں کی ثنویت کہ ایک اپنے اندر ایک سے زیادہ وجود کا متحمل نہیں ہو سکتا، جس کے نتیجے میں نور و ظلمت دو مستقل وجود قرار پاتے ہیں۔ یہ اور انھیں کی طرح کے مسائل و مباحث کا شیخ سہروردی نے اسلامی زاویہ نظر سے تجزیہ کیا اور اپنے تصور تجلی کو قرآن حکیم کی روشنی میں ترتیب دیا۔ ان کے نزدیک نور محض ایک تلازمہ نہیں ہے بلکہ ایسی حقیقت ہے، جس سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا عرفان، رسول اسلام کی ہدایت کا شعور، اہل بیت کی محبت و مودت کو اجر رسالت کی حیثیت سے قبول کرنے کی

سعادت حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نور، رسول اسلام نور، اہل بیت نور، قرآن نور، لوح نور، کرس نور بسم اللہ النور علیٰ نورٍ۔ ہدایت نور، ایمان نور، عرفان نور۔ نور کو ظلمت کے برابر قرار نہیں دیا سکتا کیونکہ نور حق سے وابستہ ہے اور ظلمت ناحق سے۔ نور حق ہی مبدائے نور ہے۔ جس کی تجلی حاصل کرنے کی خواہش مخلوقات کی جبلیت میں داخل ہے۔ اشیاء پر نور اولیٰ کے اثرات کبھی بالواسطہ اور اکثر بلاواسطہ مرتب ہوتے ہیں۔ اسی بناپر کائنات کو ایک خواہش بلور یہ قرار دیا جاتا ہے۔

نفسیاتی مطالعہ کے معیار پر تصور تجلی کے دلچسپ مباحث سامنے آتے ہیں۔ اس کا منطقی استدلال یہ ہے کہ نور کو حرکت کا متلازم نہیں قرار دیا سکتا۔ پتھر کا ایک ٹکڑا منور ہو کر لعل کی صورت میں مرئی ہے لیکن اس میں خود بخود حرکت کرنے کی قوت نہیں ہوتی۔ لیکن۔ عالم موجودات میں ایسے اعلیٰ درجہ کے اجسام بھی ہیں، جن میں حرکت اور نور بیک وقت وجود رکھتے ہیں، جن کی بہترین مثال انسان ہے، جو جسم اور روح کا حامل ہوتا ہے۔ جسم اور روح کو علت و معلول قرار دیا جاسکتا حالانکہ جسم کو تجلی کی خواہش ہوتی ہے، جس کو وہ روح کے ذریعہ حاصل کرتا ہے۔ صوفیہ جسم میں اور مبدائے نور کے درمیان براہ راست تعلق پیدا کرنے کے لیے سلوک کی مختلف منزلوں سے گذارتے ہیں۔ اس کے لیے ایک واسطہ کی ضرورت ہوتی ہے جو نور و ظلمت کے درمیان ہے اور اولیاءاللہ کے مستور و منظم روحانی سلسلے پر مبنی ہوتا ہے، جن کی آخری منزل غوثیت ہے۔ انسان تو انسان بری جانور بھی آتش سوزاں کی جانب لپکتے ہیں اور بحری جانور اپنے آبی مسکن سے باہر نکل کر کھلی ہوئی چاندنی کے دلکش نظاروں کا لطف حاصل کرتے ہیں۔ نور کی جانب مراجعت کرنا فطری انسانی میں داخل ہے۔ انسان اپنی ذات کو زیادہ سے زیادہ منور کرنے کی فکر میں تمام زندگی سرگردان رہتا ہے۔ علم اور نیکی کے ذریعہ روح کے دلچسپ موضوع پر اس سے زیادہ اظہار خیال نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس کے بعد ہم مسائل و مباحث تصور تجلی سے گذر کر فلسفہ کی سرحد میں داخل ہو جائیں گے۔

❁ تصورِ خضریت :

صوفیہ کا تصورِ خضریت علم ظاہر اور علم باطن کی تمثیل ہے، جس کا استدلال قرآن مجید سے کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں واقعہ کی تفصیلات درج ہیں، آیات کریمہ ملاحظہ ہوں :

و اذقال موسیٰ لفتٰه لاابرح حتیٰ ابلغ مجمع البحرین او امضی حقبا☆ فلما بلغا مجمع بینهما نسیا حوتهما فاتخذ سبیله فی البحر سربا فلما جاوزا قال لفتٰه اتنا غداء نا لقد لقینا من سفرنا هذا نصبا.قال ارئیت اذ اوینا الی الصخرة فانی نسیت الحوت وما انسانیه الا الشیطن ان اذکره واتخذ سبیله فی البحر عجبا. قال ذالك ما کنانبغ فارتدا علیٰ آثارهماقصصا. فوجدا عبدا من عبادنآ اتیناه رحمة من عندنا وعلمنٰه من لدنا علما قال له موسیٰ هل اتبعك علیٰ ان تعلمن من ما علمت رشدا قال انك لن تستطیع معی صبرا و کیف تصبرعلیٰ مالم تحط به خبرا☆ قال ستجدنی ان شاء الله صابرا ولا اعصی لك امرا قال فان اتبعتنی فلا تسئلنی عن شئی حتی ان احدث لك منه ذکراه فانطلقا حتیٰ اذا رکبا فی السفیة خرقها قال اخرقتها لتغرق اهلها لقد جئت شیأ امرا☆ قال الم اقل انك لن تستیطع معی صبرا☆ قال لاتوأخذنی بما نسیت ولا ترهقنی من امری عسرا☆ فانطلقا حتیٰ اذا لقیاغلما فقتله قال اقتلت نفسا زکیة بغیر نفس لقد جئت شیأ نکرا☆ قال الم اقل لك انك لن تستطیع هی صبرا☆ قال ان سالتك عن شئي بعدها فلا تصخبنی قد بلغت من لدنی عذرا☆ فانطلقا حتی اذا اتیا اهل قریة استطعما اهلها فابوا ان یضیفوهما فوجدا فیها جدارا یریدان ینقض فاقامه قال لو شئت لاتخذت علیه اجرا☆ قال هذا فراق بینی و بینك سانبئك تاویل مالم تستطیع علیه صبرا☆ اما السفینة فکانت المسکین یعملون فی البحر فاردت ان اعیبها وکان وراهم مومین فخشینآ ان یرهقهما طغینا و کفرا. فاردنا ان یبدلهما ربهما خیرا منه زکوة واقرب رحما واماالجدار فکان لغلمیں یتیمین فی المدینة و کان تحته کنزلهما و کانا ابو هما صالحا فاراد ربك ان یبلغ اشدهماویستخرجا کنزهما رحمة من ربك وما فعلته عن امری ذلك تاویل مالم تستطع علیه صبرا(اور اس وقت کو یاد کرو جب موسیٰ نے اپنے جوان سے کہا کہ میں چلنے سے باز نہ آؤں گا یہاں تک کہ دو دریاؤں کے ملنے کی جگہ پر پہنچ جاؤں یا یوں ہی برسوں چلتا رہوں۔ پھر جب دونوں مجمع البحرین تک پہنچ گئے اور اپنی مچھلی چھوڑ گئے اور

اس سمندر میں سرنگ بنا کر اپنا راستہ نکال لیا۔ پھر جب دونوں مجمع البحرین سے آگے بڑھ گئے تو موسیٰ نے اپنے جوان صالح سے کہا کہ اب ہمارا کھانا لاؤ کہ ہم نے اس سفر میں بہت تکان برداشت کی ہے۔ اس جوان نے کہا کہ کیا آپ نے دیکھا ہے کہ جب ہم پتھر کے پاس ٹھہرے تھے تو میں نے مچھلی وہیں چھوڑ دی تھی اور شیطان نے اس کا ذکر کرنے سے بھی غافل کر دیا تھا اور اس دریا میں عجیب طرح سے راستہ بنا لیا تھا۔ موسیٰ نے کہا کہ بس وہی جگہ ہے جسے ہم تلاش کر رہے تھے، پھر دونوں نشانِ قدم دیکھتے ہوئے اُلٹے پاؤں واپس ہوئے۔ تو اس جگہ پر ہمارے بندوں میں سے ایک ایسے بندے کو پایا جسے ہم نے اپنی طرف سے رحمت عطا کی تھی اور اپنے علم خاص میں سے ایک خاص علم کی تعلیم دی تھی۔ موسیٰ نے اس بندے سے کہا کہ کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں، آپ مجھے اس علم میں سے کچھ تعلیم کریں جو رہنمائی کا علم آپ کو عطا ہوا ہے۔ اس بندے نے کہا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہ کر سکیں گے۔ اور اس بات پر کیسے صبر کریں گے جس کی آپ کو اطلاع نہیں ہے۔ موسیٰ نے کہا کہ آپ انشاء اللہ مجھے صابر پائیں گے اور میں آپ کے کسی حکم کی مخالفت نہ کروں گا۔ اس بندے نے کہا کہ اگر آپ کو میرے ساتھ رہنا ہے تو بس کسی بات کے بارے میں اس وقت تک سوال نہ کریں، جب تک میں خود اس کا ذکر نہ شروع کروں۔ پس دونوں چلے۔ یہاں تک کہ جب کشتی پر سوار ہوئے تو اس بندۂ خدا نے اس میں سوراخ کر دیا ہے، موسیٰ نے کہا کیا آپ نے سوراخ کیا ہے کہ سواریوں کو ڈبو دیں، یہ تو بڑی عجیب و غریب بات ہے۔ اس بندۂ خدا نے کہا کہ میں نے نہ کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہ کر سکیں گے۔ موسیٰ نے کہا، خیر جو فروگذاشت ہوگئی، اس کا مواخذہ نہ کریں اور معاملات میں اتنی سختی سے کام نہ لیں ۔ پھر دونوں آگے بڑھے یہاں تک کہ ایک نوجوان نظر آیا اور اس بندۂ خدا نے اسے قتل کر دیا، موسیٰ نے کہا کہ کیا آپ نے ایک پاکیزہ نفس کو بغیر کسی نفس کے قتل کر دیا ہے، یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ بندہ صالح نے کہا کہ میں کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے ہیں۔ موسیٰ نے کہا کہ اس کے بعد میں کسی بات کا سوال کروں گا تو آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھیں گے کہ آپ میری طرف سے منزل عذر تک پہنچ چکے ہیں۔ پھر دونوں چلتے رہے، یہاں تک کہ ایک قریہ والوں تک پہنچے اور ان سے کھانا طلب کیا۔ ان لوگوں نے مہمان بنانے سے انکار کر دیا، پھر دونوں نے ایک دیوار دیکھی جو قریب تھا کہ گر

پڑتی۔ بندۂ صالح نے اسے سیدھا کر دیا تو موسیٰ نے کہا کہ یہ میرے اور تمہارے درمیان جدائی کا موقع ہے، عنقریب میں تمھیں ان باتوں کی تاویل بتا دوں گا جن پر تم صبر نہیں کر سکے۔ یہ کشتی چند مسکینوں کی تھی جو سمندر میں بار برداری کرتے تھے، میں نے چاہا کہ اسے عیب دار بنا دوں کہ ان کے پیچھے ایک بادشاہ تھا، جو ہر کشتی کو غصب کر لیا کرتا تھا۔ اور یہ بچہ اس کے ماں باپ مومن تھے اور مجھے خوف معلوم ہوا کہ یہ بڑا ہو کر اپنی سرکشی اور کفر کی بنا پر ان پر سختیاں کرے گا۔ تو میں نے چاہا کہ ان کا پروردگار انھیں اس کے بدلے ایسا فرزند دیدے جو پاکیزگی میں اس سے بہتر ہو اور صلہ رحم بھی۔ اور یہ دیوار شہر کے دو یتیم بچوں کی تھی اور اس کے نیچے ان کا خزانہ دفن تھا اور ان کا باپ ایک نیک بندہ تھا تو آپ کے پروردگار نے چاہا کہ یہ دونوں طاقت و توانائی کی عمر تک پہنچ جائیں اور اپنے خزانے کو نکال لیں۔ یہ سب آپ کے پروردگار کی رحمت ہے اور میں نے اپنی طرف سے کچھ نہیں کیا ہے اور یہ باتوں کی تاویل ہے، جن پر آپ صبر نہیں کر سکے ہیں: الکہف ۱۸/ ۶۰۔۸۲)

ان آیات کریمہ کا تفصیلی متن پیش کر دینا اس لیے ضروری تھا کہ صوفیہ کے تصور خضریت کے یہی اصل ماخذ ہیں، جن پر پورے عقیدہ کا دار و مدار ہے۔ ان سے اس طبقہ کے صوفیہ مندرجہ نتائج بر آمد کرتے ہیں:

اولاً یہ کہ علم باطن، اللہ تعالیٰ کے علم خاص کا ایک خاص جزو ہے، جس کو اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص بندوں کو تعلیم کرتا ہے۔

ثانیاً یہ کہ علم باطن کے حامل اولیاء ہیں، جن کے نمائندہ حضرت خضر ہیں اور علم ظاہر کے حامل انبیاء ہیں، جن کے نمائندہ حضرت موسیٰ ہیں۔ یہ دونوں علوم مرسل اعظم ﷺ کی شخصیت میں یکجا ہو گئے۔

ثالثاً یہ کہ علم ظاہر کے حامل انبیاء کو علم باطن کے حصول کے لیے اولیاء کی جانب رجوع کرنا پڑتا ہے، جیسا کہ موسیٰ نے خضر کی جانب رجوع کیا۔

رابعاً یہ کہ وَلا اعصی لك امراً (اور میں آپ کے کسی حکم کی مخالفت نہیں کروں گا) کا مفہوم یہ ہے کہ مرید اپنے شیخ پر کبھی کوئی اعتراض نہ کرے۔۔۔ نہ اقوال پر، نہ افعال پر اور نہ احوال پر۔ اگر

کوئی ایسا معاملہ دیکھے جو اس کے خیال میں عقل و شریعت کے خلاف ہو تو اس سے انکار نہ کرے اور شیخ کی طرف سے بد گمان نہ ہو بلکہ حسن ظن قائم کرے کہ شیخ کے معاملات درست ہیں، وہ اپنی رائے کا مجتہد ہے، جو غلطی نظر آ رہی ہے، وہ مرید کی اپنی نارسائی عقل کج فہمی اور کم علمی کا نتیجہ ہے۔

خامساً یہ کہ اللہ تعالیٰ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے شیخ کی اندھی پیروی کرنا لازمی شرط ہے، جیسا کہ موسیٰ نے خضر کی اقتدا کر کے ثابت کر دیا۔ اگر مرید کو اثنائے سلوک میں تکان کا احساس ہو اور نفس شیخ کی صحبت سے مطمئن نہ ہو اور خود اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں لگ جانے کی خواہش ہو، تو اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے کیونکہ حصول مقصد شیخ کی عنایت کے بغیر ممکن نہیں جیسا کہ موسیٰ نے باوجودیکہ اثنائے سلوک میں احساس کیا اور خضر کی صحبت میں مطمئن نہ تھے مگر حصول مقصد کے لیے خضرؑ کی عنایت کے سزاوار بنے رہے۔ اور اگر داہمہ لاحق ہو جائے تو شیخ کی طرف دوبارہ رجوع کرنا چاہیے، جیسا کہ موسیٰؑ مقام خضرؑ سے چلے جانے کے بعد دوبارہ لوٹ کر آئے۔

صوفیہ کا دوسرا طبقہ پہلے سے یکسر مختلف و متضاد نتائج بر آمد کرتا ہے، جو مندرجہ ذیل ہیں:

اولاً یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص بندوں کو ہر طرح کے علومِ ظاہر و باطن کی تعلیم دیتا ہے۔ کسی نبی کے لیے عقیدہ رکھنا کہ انھیں فقط علم ظاہر ملا تھا، علم باطن سے محروم تھے، مرتبہ نبوت کی نفی ہے۔ البتہ علم کے مدارج مختلف و متنوع ہو سکتے ہیں۔

ثانیاً یہ کہ موسیٰ ؑ بھی خضرؑ کی طرح نبی ہیں۔ موسیٰؑ بھی علوم ظاہر و باطن کے حامل تھے۔ البتہ ایک خاص علم میں خضرؑ کو فضیلت حاصل تھی، قرآن کے الفاظ ہیں: وعلّمنه من لدنا علماً (اور اپنے علم خاص میں سے ایک خاص علم کی تعلیم دی تھی۔)

ثالثاً یہ کہ نہ تو خضرؑ شیخ تھے اور نہ موسیٰؑ مرید۔ اس پورے واقعہ میں پیری مریدی کا کوئی تصور نہیں ہے۔

رابعاً یہ کہ اگر کوئی معاملہ واقعات و حالات کے خلاف ہو تو اس کی وضاحت طلب کرنا چاہیے، جیسا کہ خضر سے بار بار موسیٰؑ نے سوال کر کے ثابت کر دیا ہے۔

خامساً یہ کہ موسیٰؑ سے قولی لغزش ہوئی تھی، جب انھوں نے خود کو عالم و دانا قرار دیا، جبکہ علم کا

سر چشمہ اللہ تعالیٰ ہے۔اس لیے حکم ہوا کہ خضرؑ سے ملاقات کرو تاکہ تم کو تمھارے علم کے مدارج کا اندازہ ہو جائے۔

اس تصور خضریت سے بعض دیگر اہم نکات پیدا ہوتے ہیں جن پر مفسرین نے خوب خوب موشگافیاں کی ہیں۔ تقریباً تمام بنیادی مباحث کے متعلق مفسرین کے درمیان شدید اختلافات ہیں۔ مثلاً کون موسیٰؑ ؟ یہودی ان کو موسیٰ بن میشا بن یوسف کہتے ہیں اور مسلمانوں کے نزدیک موسیٰؑ بن عمران۔ اسی طرح موسیٰ کا ہمسفر کون تھا؟ اکثر مفسرین کے نزدیک یوشعؑ بن نون تھے، جو موسیٰؑ کے بھانجے تھے۔ پھر کس سے ملاقات کو گئے ؟ بعضوں کے نزدیک ان کا نام خضرؑ تھا بعضوں کے خیال میں ان کا نام فعلیا بن ملکان تھا، لقب خضر تھا۔ بعض ان کو اللہ کا مخصوص بندہ اور بعض ملائکہ کہتے ہیں۔اسی طرح اس واقعہ کے سبب کے متعلق بھی اختلاف ہے۔ مشہور ہے کہ بنی اسرائیل نے پوچھا کہ اس وقت سب سے بڑا عالم کون ہے۔ موسیٰؑ نے جواب دیا۔ میں! حکم ہوا کہ مجمع البحرین پر جاکر میرے خاص بندے سے ملاقات کرو تاکہ تمھیں اپنے علم کے مدارج کا اندازہ ہو جائے۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ نابالغ کو قصاص کی بنا پر قتل نہیں کیا جاسکتا اور موسیٰؑ کا یہی اعتراض تھا۔امام جعفر صادقؑ کی روایت میں قریہ کا نام ناصرہ وارد ہوا ہے۔اس میں شک نہیں کہ اس واقعہ سے عبرت حاصل ہوتا ہے کہ کسی وقت بھی اپنی برتری کا خیال نہیں کرنا چاہئے کہ دنیا کے کسی گوشے میں کوئی بہتر شخص موجود ہو سکتا ہے۔

❁ تصورِ فتوت :

'فتوۃ' عربی لفظ ہے، جس کے لغوی معنی جواں مردی کے ہوتے ہیں۔وہ صوفیہ ،جو نوجوانوں کے گروہوں میں رہتے اور سپاہیانہ زندگی کی تلقین کرتے رہتے تھے، اہل فتوۃ یا جواں مرد کہے جاتے تھے۔ ان کا اپنا نظامِ تصوف تھا، جس کو 'تصور فتوت' کہتے ہیں۔اس عقیدہ کے صوفیہ نوجوانوں کو اپنا محبوب گردانتے اور ان کو مقرب الٰہی قرار دیتے۔ قرآن حکیم کی آیات کریمہ سے استدلال کرتے۔اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کو 'جوان' کہتا ہے:قالوا سمعنا فتی یذکرھم یقال لہ ابراھیم (لوگوں نے بتایا کہ ایک جوان ہے جو اس کا ذکر کیا کرتا ہے اور اسے ابراہیم کہا جاتا ہے۔)اسی طرح اصحاب کہف کے بارے میں ارشاد ہوا:انھم فتیۃ امنوا بربھم و زدنٰھم ھدی (یہ چند نوجوان تھے

جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے اور ہم نے ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیا تھا۔) حضرت موسیٰؑ حکم خدا سے مجمع البحرین کی جانب گئے تو ان کا ہم سفر ایک جوان ہی رکھا گیا:قال لفتٰہ (موسیٰؑ نے اپنے جوان صالح سے کہا۔) نوجوان بمعنی محبوب بھی ہے، جیسا کہ سورہ یوسف میں وارد ہوا ہے:امرات العزیز تراودفتھا علی نفسہ (عزیز مصر کی عورت اپنے جوان کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔)ان کے پہلو بہ پہلو مشہور حدیث قدسی ہے: لا فتیٰ الا علی لا سیف الاذوالفقار (علیؑ سے بہتر کوئی جوان نہیں ،ذوالفقار سے بہتر کوئی تلوار نہیں)اس طرح فتوت کا حضرت علی ابن ابی طالب سے براہ راست رشتہ قائم ہوتا ہے۔

فتوت کا پیش رو کون؟ ڈاکٹر سعید نفیسی نے تین دستاویزوں کا ذکر کیا ہے... پہلی دستاویز میں حضرت آدم صلی اللہ کو بانی قرار دیا ہے، جن سے یہ مسلک دیگر انبیا سے منتقل ہوتا ہوا، پیغمبر اسلام ﷺ تک پہنچا۔ انھوں نے حضرت علی کو منتقل کیا۔ ان کے بعد حضرت سلمان فارسی پھر بالترتیب دجلی انصاری، اشج، ابو مسلم خراسانی، نجدہ بن میسرہ، مالک،عبدالجبار، عبداللہ بن ہاشمی، معاذ مازنی،مظعون، مبارک بن مطاعن، حامد بن عدی اور مہدی۔ دوسری دستاویز حضرت علیؑ سے شروع کر کے سلمان فارسی اور خلیفہ ابوالعباس ناصر لدین اللہ (م: ۶۲۷ھ/۱۲۲۵ء) پر ختم ہے۔ تیسری دستاویز میں درج ہے کہ ناصرلدین اللہ نے ۵۷۸ھ/ ۱۱۸۲ء میں مسلک فتوت اختیار کیا اور مالک بن عبد الجبار کی سربراہی قبول کی۔ان کا مکمل شجرہ درج کر دیا ہے۔۵۸؎ اس میں ابو مسلم خراسانی کا نام بھی شامل ہے ۔ دیگر حکمرانوں میں جو مسلک فتوت کے قائل تھے، خاص طور پر مصر و شام کے حکمراں سلطان صلاح الدین ایوبی (م:۵۸۹ھ/۱۱ء)اور خراسان کے حکمران آل سربدار (م:۷۸۳ھ/۱۳۸۱ء) کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔اکابرین صوفیہ میں شیخ ابو حامد احمد بن خضرویہ بلخی (م:۲۴۰ھ/ ۸۵۴ء)، شیخ ابو حفص عمر بن سلمہ حداد نیشاپوری (م: ۲۶۵ھ/۸۷۸ء) شیخ ابو الحسن علی ابن احمد سہل صوفی پوشنگی (م:۲۸۴ھ/۸۹۷ء) اور شیخ عبدالقادر جیلانی (م: ۵۶۲ھ/۱۱۶۶ء) کے مآثر سے ظاہر ہے کہ انھوں نے مسلک فتوت کی ترویج کی۔ مولانا جلال الدین رومی (م: ۶۷۲ھ/ ۱۲۷۳ء) نے اپنی مثنوی میں 'اے فتیٰ' کہہ کر بار بار خطاب کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مخاطب بھی اہل فتوت ہی

تھے۔ابوالقاسم حسن بن احمد عنصری بلخی(م: ۴۳۱ھ/۱۰۳۹ء) نے فتوت کی وضاحت ان اشعار میں کی ہے:

جواں مردی از کارہا بہتر ست　　جواں مردی از خوی پیغمبر ست
دو گیتی شود بر جواں مرد راست　　جواں مرد باش و دو گیتی تراست

اور شیخ سعدی شیرازی(م:۶۹۱ھ/۱۲۹۱ء) کہتے ہیں:

جواں مردی و لطفست آدمیت　　ہمین نقش ہولائی مپندار

مذکورہ بالا اشعار میں تصوف اور فتوت ہم معنی اصطلاحات کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ قشیری نیشاپوری کی رسالہ قشیریہ، ابو عبدالرحمن نیشاپوری کی 'کتاب الفتوۃ' شیخ شہاب الدین سہروردی کی 'عوارف المعارف' وغیرہ میں فتوت کی صوفیانہ تاویلات درج ہیں۔

فتوت کا اپنا تاریخی وسیاسی منظر نامہ ہے۔اہل فتوت کی جماعت کی تشکیل اسلامی معاشرے کی ناگزیر صورت حال کی بنا پر ہوئی، جو دور صدر اسلام کے (۴۰ھ/۶۶۱ء کے بعد) ملتِ اسلامیہ شدید بحرانی کوائف، چیرہ دستیوں اور ملی تعصبات کا شکار ہوئی۔اموی خلفاء کے ذریعہ اسلامی اقدار کی پامالی کے خلاف صف آرائی میں خراسان اور سیستان کے عوام پیش پیش تھے، جنھوں نے ظلم واستبداد سے ادب مسلم خراسانی(م: ۱۳۷ھ/۷۵۴ء) کی رہنمائی میں بنوامیہ کا تختہ الٹ دیا۔ پھر بنو عباس تخت و تاج کے مالک بنے تو انھوں نے اپنے تمام وعدوں کو فراموش کر کے وہی غیر اسلامی روش اختیار کی، جو بنوامیہ کا شعار تھی اور اہل فتوت کے رہنما ابو مسلم خراسانی کو قتل کر دیا۔اس سے اہل فتوت میں شدید برگشتگی پیدا ہوئی اور انھوں نے بنو عباس کے خلاف صدیوں تک جہاد جاری رکھا۔ چونکہ اہل فتوت کے ہاتھوں اہل حکومت کو شدید جانی و مالی نقصان کا سامنا تھا، اس لیے ان کو زیر کرنے کی مہم میں ہر طرح کے جائز و ناجائز حربے استعمال کیے گئے۔ علم عوام کو برگشتہ کرنے کی غرض سے مختلف النوع اتہامات سے متہم کیا گیا۔ عباسیوں کے دور میں ہر وہ شخص، جو ان کے مسلک سے اختلاف رکھتا ہو، بے دریغ 'خارجی' کا لقب پاتا تھا۔ جواں مرد بھی خارجی قرار پائے گئے۔ چونکہ ان میں بیشتر ایرانی تھے، عربوں نے نسلی تعصب میں انھیں 'عیار' بھی کہا۔ مزید یہ کہ اہل فتوت نوجوانوں کی اپنی نگرانی میں پرورش کرتے اور انہیں اپنے طور وطریق سے آشنا کرتے تھے اس لیے ان کو 'لوطی' یا 'الواط' بھی کہا گیا۔ چونکہ ان کی اکثریت مشہد میں

رہتی، اس لیے ان کو پہلے 'مشہدی' پھر 'شہدی' کہا گیا اور ہندوستان میں 'شہدے' کہلائے گئے۔ اہل فتوت آپس میں ایک دوسرے کو 'اخ' 'اخی' یا 'برادر' کہتے تھے، جن سے بعد میں 'داداش یا 'داش' کہلائے۔ کون جانے ہمارے یہاں گنڈے کے لیے جو 'دادا' کی اصطلاح جاری ہے۔ اسی 'داداش' سے ماخوذ ہو!

اہل فتوت کی مشہور ترین بغاوت کا علم سیستان کے حمزہ بن آذرک نے ۱۷۹ھ/۷۹۵ء میں بلند کیا تھا، جو سیستان میں عباسیوں کے علی الرغم حاکم بنا رہا اور ۲۱۲ھ/۸۲۷ء میں قتل ہوا۔ ایران میں صفوی شاہی کے دور (۳۶۸-۴۳۰ھ/۹۷۸-۱۰۳۸) میں قزلباشوں (جو زیادہ تر اہل فتوت میں تھے) اور شاہ نعمت اللہ ولی کے ایرانی مریدوں (جو زیادہ تر اہل تشیع تھے) کے درمیان خون خرابہ ہونے لگا، جس سے حکومتی امن وامان کو خطرہ لاحق ہوا تو بادشاہ کے حکم سے قزلباشی اہل فتوت کے تمام اسلحے ضبط کر لیے گئے، جو ایران میں 'جواں مردوں' کے زوال کا باعث ہوا اور ان کے مراکز جو 'لنگر' اور 'زاویہ' کہے جاتے تھے، بند ہو گئے۔

اہل فتوت کے دو طبقے تھے.... ایک طبقہ قولی کہلاتا تھا، جو مسلک فتوت پر دل وجان سے عمل پیرا ہوتا جہاد باللسان تک محدود تھا۔ ان کا دوسرا طبقہ سیفی کہلاتا تھا، جو اسلامی اقدار کی ترویج و اشاعت اور تحفظ کے لیے تلوار اٹھانے سے بھی گریز نہ کرتا تھا۔ اہل فتوت کے لیے بہتر صفات سے متصف ہونا لازمی ہے، جن میں چند صفات یہ ہیں—راستی، وفاشعاری، قید نفس سے آزادی، چشم و دامن کی پاکیزگی، دوسروں کے لیے وہی چاہنا جو اپنے لیے چاہے، غرور و تکبر سے بری رہنا، خود کو چیونٹی سے بھی کمزور سمجھنا، نامرادوں کی مرادیں بر لانا، اپنا پورا راز کسی سے نہ کہنا، بن بلائے کہیں نہ جانا، دوست کو شہوت کی نگاہوں سے نہ دیکھنا، نوجوانوں کی اپنی اولاد کی طرح تربیت کرنا، صبر اختیار کرنا، حصول تجلی کے لیے شمع کی طرح جلتے رہنا وغیرہ۔ ان میں سے کسی ایک شرط سے انحراف کا مرتکب درجہ فتوت سے گر جاتا تھا۔ لیکن اس کے برعکس بغدادی اہل فتوت کے متعلق ڈاکٹر سعید نفیسی نے لکھا ہے کہ بغدادی اہل فتوت اپنے مسلک میں جس حد تک دروغ گوئی، عورتوں سے دست درازی، زنا اور لوگوں کی دل آزاری کو برا سمجھتے تھے، اس حد تک اپنے مخالفین کے مال ومتاع کو لوٹ لینے کو برا نہ سمجھتے

تھے۔ ان اہل فتوت نے راہزنیاں بھی کیں لیکن یہ لوگ اپنے ناموس کے متعلق اتنے سخت گیر تھے کہ اگر اپنی بیوی، بہن یا بیٹی کے متعلق کوئی نازیبا بات سن لیتے، تو بلا کسی تحقیق کے، قتل کر دیتے تھے۔ یہ طریقہ مصر میں ہنوز جاری ہے۔[۵۹]

اہل فتوت ایک خاص طرح کالباس، جس کو سراویل الفتوۃ کہتے تھے، زیب تن کرتے۔ ان کے پاس ایک خاص طرح کا پیالہ ہوتا تھا، جس کو کاس الفتوۃ کہتے تھے، جو فتیوں کو وراثت میں ملتا۔ اس کا نقش اپنے اسلحوں پر کندہ کرتے۔ اس کو ہمیشہ اپنے پاس جیب میں رکھتے یا اپنے پٹکے سے باندھے رہتے۔ ایشیائے کوچک کے اہل فتوت کی مخصوص خانقاہیں تھیں، جن کو 'زاویہ' کہا جاتا تھا۔ ایرانی جواں مردوں کی ہر خانقاہ ایک مخصوص علم ہوتا، جس کو 'طوق' کہتے تھے اور جس جگہ یہ علم رکھا جاتا اسے 'پاطوق' کہتے تھے۔ ایران کے جواں مرد ایک مخصوص قہوہ خانہ میں جمع ہوتے اور محفل سماع آراستہ کرتے، جس کو اپنی اصطلاح میں 'دم گرفتن' کہتے۔ ایشیائے کوچک کے اہل فتوت کا لباس، صوفیہ کے نیلے لباس کے برعکس، سفید قبا کا ہوتا۔ اس کے علاوہ اپنے کندھوں پر ایک شال بھی ڈالے رہتے۔ اپنے کمر میں چاقو بھی باندھتے۔ ایرانی 'جواں مرد' چاقو کی بجائے قمہ باندھتے اور نمد کی ٹوپی پہنتے، آپس میں ایک دوسرے کو 'کاکو نمدی' کہہ کر مخاطب کرتے۔ ایشیائے کوچک کے اہل فتوت اپنے سروں پر ایک طرح کا تاج بھی رکھتے تھے، جو سلسلۂ مولویہ کے صوفیہ کی ٹوپی سے ملتا جلتا ہوتا تھا۔ عراق و مغربی ایشیا کے اہل فتوت کا مشغلہ غلہ بازی بھی تھا۔ یہ غلہ مٹی سے بنایا جاتا اور دو تاروں کی کمان میں رکھ کر چلایا جاتا۔ ہندوستان میں غلیل سے غلہ چلانے کا عام رواج ہے البتہ بعضے دو تاروں کے کمان سے بھی غلہ چلاتے ہیں۔

اہل فتوت میں شامل ہونے کے لیے تین اوصاف لازمی قرار دیے گئے تھے۔ سخا صفا اور وفا!

'سخا' کے معنی ہے کہ جو کچھ پاس ہو، راہ خدا میں خرچ کرنے سے دریغ نہ کرے۔

'صفا' یہ ہے کہ دل ہر طرح کے بغض و نفاق سے پاک ہو اور

'وفا' یہ ہے کہ اسے ہر وقت خدا اور خلق خدا کا وفادار رہنا چاہئے۔ صاحب ارادت کے لیے پانچ شرائط کا پابند ہونا لازمی ہے۔

اولاً یہ کہ صدق دل سے تائب ہو۔

ثانیاً یہ کہ علایق واشغال دنیا ترک کردے۔

ثالثاً یہ کہ دل کو زبان کا تابع رکھے۔

رابعاً یہ کہ فقط سچائی کی اقتدا کرے اور

خامساً یہ کہ مراد کا دروازہ اپنے اوپر بند کردے۔

اسی طرح اٹھائیس لوازم بھی ہیں، جن میں چار چار امور کو فرض، سنت، آداب، ارکان، مستحب وغیرہ کہا جاتا تھا۔ ان لوازم پر کمر بستہ ہونے کو اصطلاحاً 'شد' یا 'استاد شد' کہا جاتا تھا۔ وہ شخص، جس کی کمر بندی کی جاتی 'خلفِ طریق' یا 'فرزند طریق' کہلاتا۔ اس کمر بندی کی مخصوص رسم ہوتی۔ جس کی تفصیل میں جانے کا محل نہیں البتہ اس میں شمعیں روشن کرنے اور نقیب کے الله نور السمٰوٰت کی تلاوت ہونے سے اشارہ ملتا ہے کہ اہل فتوت شیخ شہاب الدین سہروردی کے تصور حقیقت نور سے ہم آہنگ تھے۔ ان اہل فتوت میں شیعی اور سنی دونوں عقائد کے صوفیہ شامل تھے۔ شام کے اہل فتوت رافضیوں کے شدید مخالف تھے اور مصری اتنے ہی غالی رافضی !

❁ تصورِ سماع :

'سماع' عربی لفظ، معنی سننا ہے:۔ 'سمع' سے مشتق ہے جو اس معنی میں شامل ہے۔ اصطلاحاً صوفیہ کی محفل جذب وکشف کو کہتے ہیں، جس میں شعر و نغمہ کے ذریعہ کیفیتِ وجد طاری کی جاتی ہے۔ 'سماع' صوفیہ کے مختلف دبستانوں میں متنازع فیہ رہا ہے۔ عراق و جزیرہ کے صوفیہ کی خانقاہوں میں نہ صرف یہ کہ محفل سماع کا رواج نہیں رہا ہے بلکہ اس کو حرام قرار دیا جاتا ہے جبکہ دیگر صوفیہ کی خانقاہوں میں محفل سماع کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ تصور سماع پر مختلف ادوار میں مسلسل بحثیں ہوتی رہی ہیں، جن کا سلسلہ ابو بکر کلاباذی کی تصنیف کتاب التعرف سے شروع ہو کر ہنوز جاری ہے۔ شیعی و سنی فقہا نے سماع کی حرمت یا حلت پر اپنی کتابوں میں مخصوص ابواب لکھے ہیں۔ امام غزالی نے بھی اپنی دو کتابوں 'احیائے علوم الدین اور کیمیائے سعادت میں اس مسئلے پر بحث کی ہے۔ انھوں نے سماع کو مباح قرار دیا ہے۔ صوفیہ میں شیخ ابو عبد الرحمن سلمٰی نیشاپوری (م: ۴۱۴ھ / ۱۰۲۳ء) صاحب تصنیف بزرگ تھے، جنہوں نے تفسیر، حدیث اور تصوف پر متعدد تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ ان مشہور کتاب طبقات

الصوفیہ کو تصوف میں بوطیقا کی حیثیت حاصل ہے۔ان کی ایک اہم تصنیف کتاب السماع بھی ہے۔

ہندوستانی تناظر میں مشہور صوفی بزرگ سید علی ہجویری کی معرکہ آرا تصنیف کشف المحجوب کا مطالعہ ناگزیر ہے، جنھوں نے سماع کو گیارھواں کشف الحجاب قرار دیا ہے۔٦٠ ان کا قول فیصل ہے کہ قوت سمع (یا سماع) کے جائز یا ناجائز اور مباح یا مکروہ ہونے کا انحصار اس پر ہے کہ کسی چیز کا سماع کیا گیا؟ کس حالت اور کس نیت و ارادہ سے۔ سماع کیا گیا؟ پس مجرد سماع، پر کوئی حکم نہیں لگایا جائے گا۔ جو حکم بھی لگایا جائے گا، وہ شئے مسموع اور سننے والے کی نیت، حالت اور کیفیت کو سامنے رکھ کر لگایا جائے گا۔انھوں نے سماع کے اقسام کر کے بتایا ہے کہ بندے کے لیے بعض چیزوں کا سماع فرض و واجب ہے، بعض کا پسندیدہ، بعض کا مباح اور بعض کا سماع حرام ہے اور بعض کا مکروہ ناپسندیدہ ہے۔ سید علی ہجویری نے سماع کی درج ذیل حد بندیاں کی ہیں:

اولاً یہ کہ قرآن حکیم کا سماع فرض و واجب ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے سماع قرآن کے اثرات پر مبنی چند واقعات کا ذکر کیا ہے۔ پھر خوش آوازی کے اثرات بیان کیے ہیں اور قرآن مجید کو خوش الحانی سے پڑھنے کے حکم کا تذکرہ کیا ہے۔

ثانیاً یہ کہ شعر کے سماع کے بارے میں انھوں نے رسول اسلام ﷺ کی ایک حدیث نقل کی ہے: کلام حسنہ حسن و قبیحہ قبیح (شعر بھی ایک کلام ہے، جو اس میں اچھا ہو، اچھا ہے، جو برا ہو، برا ہے۔)اس سے انھوں نے نتیجہ برآمد کیا ہے کہ جو باتیں نثر میں بیان کرنا اور سننا جائز ہیں ،انھیں شعر میں بھی بیان کرنا اور سننا جائز ہے۔

ثالثاً یہ کہ راگ اور گانے کے متعلق انھوں نے صوفیہ کی آرا یکجا کر دی ہیں۔ شیخ ابو عبد الرحمن سلمٰی نیشاپوری 'سماع' میں گانے اور راغ کا استعمال مباح قرار دیتے تھے۔ شیخ ذوالنون مصری کے نزدیک سماع بندے پر خدا کی طرف سے وارد ہوتا ہے اور دلوں کو حق کی طرف مائل کرتا ہے جو شخص حق کے لیے اس کی طرف جھکتا ہے، حق کی راہ پالیتا ہے، جو شخص لذت نفس کے لیے اس کی طرف آتا ہے، بے دینی کی راہ پر پڑ جاتا ہے۔ شیخ ابو بکر شبلی کے نزدیک جس شخص کا دل خدا کی محبتوں میں شرابور نہ ہو، اس کیلیے سماع فتنہ و آفت ہے۔ شیخ جنید بغدادی کے مطابق سماع جوانوں کے لیے فتنہ اور بوڑھوں

کیلیے بیہودہ کام ہے۔ امیر معاویہ پر دیگر اعتراجات کے علاوہ یہ بھی اعتراض ہے کہ وہ گانے والی لونڈیاں رکھتے تھے۔ حضرت علی نے امام حسن کو اس حبشی عورت کو دیکھنے سے منع کیا، جو گا رہی تھی اور فرمایا یہ شیطان کی ساتھی ہے۔ چنانچہ بعد کے زمانے میں راگ وسرود کے مکروہ ہونے پر اجماعِ امت ہو گیا۔

رابعاً یہ کہ وجد کے بارے میں صوفیہ متفق ہیں کہ علم وہوش کی حالت قوی تر ہے۔ عالمِ وجد میں انسان خطرے میں ہوتا ہے اور حالتِ علم میں امن وامان ہے۔ طالب کو تمام احوال میں شریعت کا پابند رہنا چاہیے لیکن وجد کی حالت میں اس پر سے خطا، ثواب، عذاب، ذلت، عزت وغیرہ ساقط ہو جاتی ہیں۔ علم کی حالت میں وہ امر ونہی کی پناہ میں ہوتا ہے۔

خامساً یہ کہ وجد کی حالت میں رقص لہو ولعب میں داخل ہے۔

سادساً یہ کہ مجمع میں بزرگ صوفیہ کی موجودگی میں درست لباس کو پھاڑ کر چیتھڑے کرنا جائز نہیں ہو سکتا اور عملِ فساد ہے۔ لیکن اگر سامع پر غلبہ ظاہر ہو، قابلِ خطاب نہ رہ جائے، بے خبر ہو جائے تو ایسا شخص معذور سمجھا جائے گا۔

خواجہ سید محمد حسینی بندہ نواز گیسودراز (م: ۸۲۵ھ / ۱۴۲۱ء) سلسلہ چشتیہ کے اہم ترین بزرگوں میں ہیں۔ انھوں نے خواجہ ضیاءالدین ابو نجیب سہروردی کی کتاب آداب المریدین کی شرح و ترجمہ کیا ہے، جس کا ایک اہم باب اباحتِ سماع سے متعلق ہے۔ متاخر ہندوستانی صوفیہ میں شیخ محمد نور اللہ قدوسی کی فارسی تصنیف ازالۃ الفتاح عن وجوہ السماع میں سماع کی حلت پر دلائل پیش کیے ہیں۔ ہندوپاک کے صوفیہ میں عام طور پر اور سلسلہ چشتیہ میں خاص طور پر سماع کو خانقاہی زندگی کا اہم ترین رکن ہے۔ ہاتھوں کو اٹھا کر اور پیروں سے تھرک تھرک کر رقص کرتے ہیں۔ شیعی صوفیہ بھی سماع کے رسیا رہے ہیں۔ سلسلہ نعمۃ الہیہ کے صوفی شیخ زین العابدین تمکین شیروانی مست علی شاہ (م: ۱۸۳۸ء) نے اپنی کتاب دربیان تحسین صوت وحرمت غنا وفرق میانہ رغنا وصوت حسن میں شیعی فقہاء کے فتوؤں کو جمع کر کے سماع کی حلت کے لیے جواز پیدا کیا ہے۔

❁ تصورِ عشق :

'عشق' عربی لفظ ہے، جس کے معانی ہیں— کسی کو نہایت دوست رکھنا، شوق، آرزو، سلام رخصت، شاباش، آفریں اور ایک قسم کا جنون جو حسن کو دیکھنے سے پیدا ہو جاتا ہے لیکن بعض اس کو 'عشقہ' سے مشتق قرار دیتے ہیں، جو ایک قسم کی بیل ہوتی ہے۔ (ہندی میں اس کو' امر بیل 'یا'اکاس بیل 'کہتے ہیں۔) اس کی خصوصیت ہوتی ہے کہ یہ جس درخت سے لپٹ جاتی ہے، خواہ کتنا ہی تندرست وتوانا ہو ،اس کو سکھا کر چھوڑ دیتی ہے۔ یہی خصوصیت عشق کی بھی ہے کہ جس پر حاوی ہوا، تمام کر کے ہی دم لیا۔ بیل سے یہ بھی مناسبت ہے کہ اس کی جبلت میں لپٹنا ہے اور عشق کا مدعا وصال ہے! عشق، ترکی لفظ بھی ہے (بکسر عین وشین) معانی عربی کی طرح ہیں۔ ممکن ہے کہ معشوق ترک کی الفت ہو۔ صوفیہ عشق کے دلدادہ رہے ہیں۔ انھوں نے عشق کو دو زمروں میں تقسیم کیا ہے— اولاً، عشق حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ کا عشق جو اصلی عشق ہے۔ ثانیاً، عشق مجازی یعنی بناوٹ کا عشق، جھوٹا عشق، نفسانی عشق اور دنیوی معشوقوں سے عشق، جس کا عام چلن ہے۔ مدعا دونوں طرح کے عشق کا ایک ہی ہے، وصال!

عشق قرآنی لفظ نہیں ہے۔ اس مفہوم کی ادائیگی کے لیے قرآن میں حب، محبّ، محبت، مودت وغیرہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اس سے فی نفسہ ثابت ہوتا ہے کہ تصورِ عشق قرانی مفاہیم سے مختلف الامر شے ہے۔ قرآن میں محبت کے منازل کا بیان موجود ہے: قل ان کنتم تحبون الله فاتبعون یحببکم الله (اے پیغمبر کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا بھی تم سے محبت کرے گا: آل عمران ۳۱/۳) القیت علیك محبة منی (اور ہم نے تم پر اپنی محبت کا عکس ڈال دیا: طٰہٰ ۳۹/۲۱) و من الناس من یتخذ من دون الله انداداً یحبّونهم کحب الله والذین امنوا اشد حبا لله (لوگوں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں، جو اللہ کے علاوہ دوسروں کو اس کا مثل قرار دیتے ہیں اور ان سے اللہ جیسی محبت بھی کرتے ہیں، جبکہ ایمان والوں کی تمام تر محبت خدا سے ہوتی ہے: البقرہ ۱۶۵/۲)فقال انی احببت حب الخیر عن ذکر ربی (توانھوں نے کہا کہ میں ذکر خدا کی بنا پر غیر کو دوست رکھتا ہوں: ص ۳۲/۳۸)وانہ لحب الخیر لشدید (اور وہ مال کی محبت میں بہت

سخت ہے:العادیات ۱۰۰/ ۸)

پھر سوال اٹھتا ہے کہ واضح قرآنی اصطلاح کی موجودگی کے باوصف صوفیہ نے غیر قرآنی اصطلاح کیوں اختیار کی۔ اس سوال کا جواب یحیٰی بن خالد البرمکی کی موجودگی میں منعقدہ مباحثہ میں ملتا ہے، جس میں بقول المسعودی مختلف مذہبی تصورات کے تیرہ نمائندوں نے شرکت کی تھی۔ جن میں ایک زرتشتی عالم دین بھی تھا۔ المسعودی نے اس بحث کی تفصیلات درج کی ہیں اور عشق کی مختلف تعریفات میں یونانی مفکروں کے اقوال بھی قلم بند کیے ہیں، جن میں جالینوس، بقراط وغیرہ شامل ہیں۔[۱۶] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اصطلاح عشق اصلاً یونانی اصطلاح agape/eros کی صدائے بازگشت ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہے کہ تیسری صدی ہجری (نویں صدی عیسوی) میں یونانی اور اسلامی تصورات کا باہمی تعلق اس قدر پیچیدہ تھا کہ ان کے درمیان خط امتیاز کھینچنا دشوار ہو گیا تھا۔ خاص طور پر طریقت بن کر یونانی عشقہ شریعت سے ایسی لپٹی کہ اس کا عرق چوس چوس کر موٹی ہوتی گئی۔ علی الاعلان احکام شرعیہ کی خلاف ورزی ہوئی تو رد عمل میں بعض علمائے شریعت نے تمام اہل طریقت کو کفر وشرک کے فتوے سے نواز دیا۔

تصور عشق میں یونانی جدلیات کے استعمال نے اسلامی روح کو کس حد تک بیدار یا خوابیدہ کیا، اس کا صحیح اندازہ اس صورتِ حال سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے پہلی بار امام الغزالی (م:۵۰۵ھ/ ۱۱۱۱ء) کی تشکیک کی صورت میں نمودار ہو کر تصوف میں جگہ بنا ئی۔ شیخ شہاب الدین سہروردی (م۔:۶۳۲ھ/ ۱۲۳۴ء) نے کشف الفضائح الیونانیہ میں یونانی فلسفہ کے زائیدہ تصور عشق کی بیچارگی واضح کر دی ہے۔ ان کے علاوہ شیخ ابو بکر الرازی (م:۳۱۳ھ/ ۹۲۵ء) اور شیخ ابن تیمیہ (م: ۱۳۲۸ء) نے نہ صرف یہ کہ تصور عشق کی خلقی کمزوریوں کو منظر عام پر نمایاں کر دیا جس سے تصورِ عشق صوفیہ میں خود آگاہی کا وسیلہ بن گیا، جس سے ایک ابدی و سرمدی مقدس ہستی کی طلب و جستجو کا تحرک ہوتا ہے۔ اس سے عشق کو فوق الکائناتی تصور کی حیثیت حاصل ہوئی۔ بقول علامہ اقبال:

عشق دم جبرئیل، عشق دل مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

عشق فقیہ حرم ، عشق امیر جنود
عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمہ سازِ حیات
عشق سے نور حیات، عشق سے نار حیات

عشق کے اسباب، مظاہر اور درجات کے متعلق صوفیہ کے علاوہ دیگر علمار و فقہاء نے بھی اظہار خیال کیا ہے، جن میں الجاحظ کو اہمیت حاصل ہے، جس نے اس موضوع پر ایک مستقل تصنیف رسالۃ فی العشق یادگار چھوڑی ہے۔ اس کے نزدیک کسی محبوب شے یا ہستی کے حصول کی خواہش کو عشق کہتے ہیں ۔اس محبوب شے یا ہستی کو 'معشوق' اس کے حصول کی خواہش کو 'شوق' یا 'تشویق' اور اس تجربے سے گذرنے والے کو 'عاشق' کہتے ہیں جو اپنے وجود میں کسی کمی یا نقص کے احساس سے مضطرب رہتا ہے اور حصولِ کمال کے لیے ہر قیمت پر جد و جہد کرتا ہے۔ یہ کمی یا نقص روحانی اور جسمانی دونوں طرح سے ممکن ہے۔ اس لیے عشق کے مراتب بھی پست یا بلند ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان کا مدعا ایک ہی ہوتا ہے، جو ان کے دل و دماغ اور احساس و شعور پر مسلط رہتا ہے۔ اس مدعا کا نام ہے، جمال (حسن) کی انتہائے آرزو (توقان)، جس کو اللہ تعالیٰ نے عالم موجودات میں آدم کو اپنی صورت عطا کر کے واضح کر دیا ہے۔ اسی بنا پر آنکھوں اور کانوں کو اعضائے رئیسہ قرار دیا گیا ہے کیونکہ ان سے 'حسن' کا ادراک ہوتا ہے۔ اسی میں انسانی حسن و جمال، قدرتی مناظر اور خوش آئند آوازیں شامل ہیں۔ یہی صوفیہ کے نزدیک حسن و نیکی (خیر) اور سچائی (حق) ہے، جو ناقابل تقسیم وحدت کے مختلف مظاہر ہیں۔ [۶۳] الدیلمی کے نزدیک عشق کے ارتقا کے تین مقامات ہیں محبۃ طبیعیۃ، محبۃ عقلیہ اور محبۃ الٰہیہ۔ [۶۴]

تصور عشق کی ایک اور توجیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ تمام موجودات میں اپنے وجود سے بلند تر درجہ کو حاصل کرنے کی شدید خواہش ہوتی ہے جس کو ابن مسکونہ نے 'عشق کائناتی' قرار دیا ہے۔ یہی عشق کائناتی انسانوں کے درمیان بھی ہوتا ہے۔ کوئی انسان کسی دوسرے انسان سے انسیت رکھ سکتا ہے، جو رفتہ رفتہ عشق کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ معشوق کے حصول کی شدید خواہش بسا اوقات دماغی عدم توازن پیدا کر دیتی ہے۔ اس لیے صوفیہ عشق کو عبادت الٰہی کی شکل میں ڈھالنے کی ترغیب کرتے

ہیں، جس میں جوش جذبات (غلیان) کی حالت میں روح کے 'مہذب' خیالات کا ارتکاز ہو سکتا ہے۔ اسی عمل ارتکاز کو خیالات و جذبات کو 'صوریانہ' (Formalization) کہتے ہیں جو عراق و جزیرہ کے صوفیہ میں اس قدر پھیل گیا کہ معاشرتی رسم و رواج، اخلاقی نظام اور حسن کی جانب قدرتی میلان کے مختلف کرداروں کے اثرات کا تعین کرنا دشوار ہو گیا۔ ۲۵

اہل فلسفہ میلان عشق کو ایک ایسی عقلی چیز قرار دیتے ہیں جو اس بلند ترین مسرت (السعادۃ القصوی) کی جانب کسی غیر ارادی لیکن واضح و باقاعدہ میلان کی صورت میں رونما ہوتی ہے لیکن اس عقل کو حواس خمسہ کے پیدا ہوئی اشتباہات سے مبرا ہونا چاہئے تاکہ عشق خالص نیکی کا مفہوم حاصل کر سکے۔ یہی خالص نیکی (الخیر المحض) انسان کو سچی واحد ہستی (الواحد الحق) کی تلاش میں جتنا آگے بڑھاتا ہے، اتنا ہی اسے اپنے وجود میں ناقابل محو خوشی (ابتہاج) خالص لذت (اللذۃ المطلقہ) کا احساس ہوتا ہے، جس کیا آخری منزل ذات واجب الوجود کے کمال و حسن کا مشاہدہ ہے۔ ۲۶ (جاری)

حواشی :

۱ Reconstruction of Religious Thought Mohammad Iqbal in Islam اردو ترجمے: تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ از سید نذیر نیازی (دہلی ۱۹۹۲ء) اور تفکرِ دینی پر تجدیدِ نظر از محمد سمیع الحق (دہلی ۱۹۹۴ء)

۲ القشیری: الرسالہ ص ۱۵۸ (ترجمہ بندہ نواز گیسودراز، سالار جنگ لائبریری حیدر آباد)

۳ ابو نصر سراج: کتاب اللمع ص ۲۴

۴ ابو بکر محمد الکلاباذی: التصرف المذہب اہل تصوف باب ۲۱

۵ ابو طالب مکی: قوت القلوب فی معاملہ المحبوب ۵ ص ص ۲۰۱-۱۹۵

۶ سعید نفیسی سرچشمہ تصوف در ایران ص ۳۳ (کتاب فروشی مہرماہ ۱۳۴۶ھ ش)

۷ المسعودی: مروج الذہب ج ۲ ص ۵۱۵

۸ : سرچشمہ تصوف در ایران ص ۳۳

۹ The Development of Metaphysics in Persia Mohammad Iqbal

فلسفہ عجم ، ردو ترجمہ: میر حسن الدین ص۷۳ (حیدر آباد ۱۹۵۶ء)
۱۰ اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۶ ص ص ۲۴_۴۲۳ (لاہور ۱۹۶۲ء)
۱۱ فلسفہ عجم ص۱۱۸
۱۲ سر چشمہ تصوف در ایران ص ۲۱۲
۱۳ سید ابوالاعلیٰ مودودی اسلامی نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصورات ص ص ۵۳_۵۲ ۴
۱۴ سر چشمہ تصوف در ایران ص ۱۰۴
۱۵ ایضا ، ص ص ۸_۷
۱۶ ایضا ، ص ص ۸_۷
۱۷ محمد اسداللہ وانی: شیخ العالم ایک مطالعہ ص ص ۶۳_۷۴ (سری نگر ۱۹۹۳ء)
۱۸ (S.A.H. AbidiNew Delhi) Sufism in India
۱۹ سر چشمہ تصوف در ایران ص ۲۱۲
۲۰ ایضاً ایضا ص ۲۴
۲۱ فلسفہ عجم ص ص ۳۴_۱۵
۲۲ صحیح بخاری ۵۹ (خلق:۱)
۲۳
Louis Massign Lapasion de al-Husyn alMansour al Hallaj The Passion of al Hallaj p ranslated by Herbert Mason Princeton University Press Royal Asiatic Society Journal,
۲۵ :فلسفہ عجم ص ص ۶۶_۴۷
۲۶ ایضاً ایضا ص ۱۵۷
۲۷ ایضاً:یضا ص ص ۱۲_۱۱۱
۲۸ राज बली पाण्डे य रू हिन्दू धर्म कश पू 23 लखनऊ (1988)
۲۹ کشف المحجوب ص ۲۲۶

۳۰ ایضاً ص۲۶۷

۳۱ ایضاً ص۲۶۹

۳۲ افکار رومی ص ص۳۰-۳۲۲

۳۳ عبدالرحمٰن جامی: نفحات الانس ص ص۵۱-۴۹

۳۴ کتاب اللمعص ۳۵۲

۳۵ बृहदारयकउपनिषद्र प 474

۳۶ کتاب اللمعص ۳۸۴

۳۷ سید اعجاز حسین : مذہب اور شاعری ص۳۲ (کراچی ۱۹۵۵ء)

۳۸ یوسف سلیم چشتی: تاریخ تصوف ص۲۶۵

۳۹ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ ج۶ ص ص۲۴-۴۲۲

۴۰ ابو علی حسین ابن سینا: القاھرۃ ص ص۴۰۲، ۳۸۱

۴۱ ایضاً اشاراۃ باب۹ ص۱۱۸

۴۲ غزالی مقاصد الفلاسفہ ص۴

۴۳ فلسفہ عجم ص۵

۴۴ The Passion of al-Hallaj p 401

۴۵ Sufism in India p. 26

۴۶ Nasr SA : Sufi Essay, pp. 99-102 (London 1972)

۴۷ سید ابوالاعلیٰ مودودی: تجدید و احیائے دین ص۸۱ دہلی ۱۹۸۶ء)

۴۸ سید احمد عروج قادری: تصوف اور اہل تصوف ص۲۰۶ (دہلی ۱۹۹۰ء)

۴۹ یہ مکتوب شیخ عبدالحق محدث دہلوی بنام شیخ احمد سرہندی (حیات شیخ عبدالحق خلیق احمد نظامی میں شامل ہے۔

۵۰ مکتوبات امام ربانی ج۲ مکتوب ۵۵ (مطبوعہ نولکشور)

۵۲ ایضاً ایضا

۵۳ کشف المحجوب ص ص ۲۲۔۲۰۴

۵۴ بنی پرشاد: تاریخ جہاں گیر (اردو ترجمہ: رحم علی الہاشمی) ص ۳۲۸ (دہلی ۲۰۰۰ء)

۵۵ Faruqi, Burhan Ahmad : Mujaddid;s Conceps of Tawhid p. 114 (Lahore 1940)

۵۶ فلسفہ عجم ص ص ۴۶۔۱۲۷

۵۷ ایضاء ص ۱۳۳

۵۸ سرچشمہ تصوف در ایران ص ۱۴۲

۵۹ ایضاً ص ۱۵۳

۶۰ کشف المحجوب ص ص ۳۵۔۴۱۲

۶۱ المسعودی، مروج الذہب ۶: ۸۸۔۳۸۶

۶۲ الجاحظ: الرسالہ ۱۱ ص ص ۶۹۔۱۶۱؛ رسائل طبع السنوی ص ص ۶۷۔۲۷۵

۶۳ الدیلمی: عطف علی الالف المالوف علی الآم، فصل ۵ ص ۸۷ (قاہرہ ۱۹۶۲ء)

۶۴ المسکونہ: تہذیب الاخلاق ص ۶۴ (بیروت ۱۹۲۷ء)

۶۵ اردو، دائرہ معارف اسلامیہ ج ۶ ص ۳۵۲

۶۶ ابن الجوزی: صید الخاطر ص ص ۱۰۷۔۱۰۵

☆☆☆

عید قربان

مکہ معظمہ اور خانہ کعبہ وہ مقدس جگہ ہے جہاں فریضہ حج کی ادائیگی کا شرف حاصل کرنے کے لئے مشرق و مغرب اور جنوب و شمال غرض کہ دنیا کے ہر گوشے میں زندگی بسر کرنے والے ہزاروں مسلمان ہر سال جمع ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ خانہ کعبہ عاشقان توحید کی عالمی ملاقات کی جگہ ہے۔

مسلمانوں کی آسمانی کتاب یعنی قرآن حکیم میں خانہ کعبہ ارو مناسک حج کے سلسلے میں جو حقائق بیان کئے گئے ہیں ان کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اللہ کا یہ مقدس گھر اور توحید کی یہ مضبوط چھاؤنی لوگوں کے لیے بہترین نمونہ عمل اور انسانوں کی ہدایت ور ہنمائی کا مبارک وسیلہ قرار پائے اور وہاں ایسے خصوصی مراسم ادا کئے جائیں جو اس کی عظمت و پاکیزگی کا مظہر ہوں اور جن کے ذریعہ اس کے مقاصد کی مکمل ترجمانی بھی ہو سکے۔ ایسے مراسم جو لوگوں کی زندگی اور ان کے دلوں کو غیر خدا اور ہر قسم کے شرک سے نجات دلا سکیں۔ خدا کے سیدھے اور سچے راستہ کی طرف لوگوں کی رہنمائی کریں اور عوام الناس کی مخلصانہ زندگی کی راہ ہموار کردیں۔

مراسم حج کا آخری حصہ حلال گوشت حیوان (اونٹ، بھیڑ، بکرے...) کی قربانی پر مشتمل ہے۔ خانہ کعبہ کی تعمیر سے فراغت حاصل کرنے کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے خداوند عالم کی راہ میں ایک حیوان کی قربانی دیکر اس الٰہی رسم کی بنیاد رکھی تھی۔ کعبہ کی تعمیر کرتے وقت حضرت ابراہیمؑ کی دلی خواہش یہ تھی کہ پروردگار ان کے دونوں بیٹوں کو مسلم یعنی احکام خداوندی کا تابع و فرمانبردار بنادے۔ یہ اتنا عظیم مرتبہ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ جیسا عظیم المرتبت پیغمبرؑ اپنے پروردگار سے اس کا مطالبہ کرتا ہے اور راہ خدا میں سخت امتحانات کی منزلوں سے گزرنے کے بعد بھی وہ خود کو مسلم نہیں سمجھتا۔

ان کے دل میں یہ خیال موجود تھا کہ انھوں نے خواب دیکھا کہ خدا کی راہ میں انھیں اپنے فرزند اسمٰعیلؑ کو ذبح کردینا چاہئے۔ یہ عجیب طاقت فرسا اور مشکل امتحان تھا! ایک سن رسیدہ باپ کو اپنے

جوان بیٹے کی قربانی پیش کرنی ہے۔

ابتدائی مرحلہ میں بیٹے کی محبت نے انہیں اس کام سے روک دیا یعنی اطاعت اور عشق خدا وندی کی جگہ منطق نے لے لی اور ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید میرا خواب درست نہیں تھا۔ ان کے دل میں بیٹے کی محبت کا دریا رواں ہو جاتا ہے اور وہ منطقی دلائل کی روشنی میں یہ سوچنے لگتے ہیں کہ آخر ایک باپ اپنے جگر کے ٹکڑے کو اپنے ہاتھوں قتل گاہ تک کیسے لے جاسکتا ہے؟

غور فکر کا مقام ہے کہ بیٹے کی محبت حضرت ابراہیمؑ جیسے صاف عزم اور بت شکن پیغمبر کو امتحان و آزمائش کی آخری منزلوں تک کھینچ لائی ہے۔

لیکن اس الٰہی پیغام کی تکرار کے بعد انھوں نے حکم خداوندی کے آگے سر تسلیم خم کر دینے کا اٹل فیصلہ کر لیا اور کسی قسم کے شک و تردید کو کوئی اہمیت نہ دی۔ حضرت ابراہیمؑ نے سمجھ لیا تھا کہ یہ پیغام پیغام خداوندی ہے اور ان کو اس پیغام کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا ہے۔

ابراہیمؑ اپنے دل کو پروردگار کے سپرد کر دیتے ہیں اور اپنے فرزند سے یوں خطاب کرتے ہیں۔

"میرے فرزند اسماعیلؑ! میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے ذبح کر رہا ہوں۔" فرمانبردار بیٹا! اپنے باپ کے سامنے غیر معمولی صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیتا ہے۔

"یاابت افعل ماتومرستجدنی ناشاء الله من الصابرین۔" یعنی والد محترم! پروردگار عالم نے آپ کو جس چیز کا حکم دیا ہے اسے انجام دیجئے۔ انشاءاللہ اس عظیم امر الٰہی میں آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔

حضرت ابراہیمؑ نے چھری اور رسّی اٹھائی۔ اور تمام دیکھنے والوں کی نگاہ بچاتے ہوئے اپنے لڑکے کو لے کر جنگل کی طرف نکل پڑے۔ ہر ممکن کوشش کی مگر چھری ان کے فرزند کو ذبح نہ کر سکی۔ دوسری مرتبہ انھوں نے چھری کی دھار تیز کی۔ حکم الٰہی کی تعمیل میں تاخیر کی وجہ سے انہیں اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا۔ اپنے فرزند اسمٰعیل کے گلے پر چھری چلائی۔ اس بار چھری کے نیچے ایک دنبہ آگیا اور آسمان سے یہ آواز آئی۔ "اے ابراہیمؑ! خداوند عالم نے ذبح اسماعیل سے درگزر اختیار کر لیا ہے اور یہ دنبہ بھیج دیا ہے تاکہ اسمٰعیل کی جگہ پر تم اسے ذبح کرو۔ تم نے الٰہی حکم کو بخوبی انجام دیا ہے۔" اللہ اکبر۔

اس طرح حج کے آخری دن حلال گوشت حیوان کی قربانی حج کے ضروری اعمال کا جز بن گئی۔ قربانی یہ ظاہر کرتی ہے جس طرح نباتات کے جسم میں عناصر فنا ہو جاتے ہیں اور حیوانات انسانوں کی قربانی قرار پاتے ہیں بالکل اسی طرح انسان کو چاہئے کہ وہ حق کی راہ میں خود فنا ہو جائے او حقیقی خیر و

عید قربان مبارک ہو

دنیا بھر کے مسلمانوں کو عید قربان مبارک ہو۔ یہ عید آج بھی حضرت ابراھیم خلیل اللہ کی اس عظیم قربانی کی یاد تازہ کرتی ہے جس کے تحت مالک کائنات کی خوشنودی کے لئے اس پیغمبر توحید نے شرک وشیطان کے خلاف جہاد کرتے ہوئے بارگاہ ایزدی میں اپنا سر تسلیم خم کر دیاتھا ۔ اور عظیم اسلامی کانگریس یعنی حج بیت اللہ الحرام کے دوران تاقیام قیامت ان کے جملہ اعمال کی پیروی تمام مسلمانوں کے لئے واجب ہے۔

خدا کرے کہ دنیا کے تمام مسلمان حج بیت اللہ کے سلسلے میں اپنے فرائض سے پوری طرح باخبر ہوجائیں اور اس مقدس فریضے کو ادا کرتے وقت پیغمبر اسلام کی پیروی کریں۔ (ادارہ)

نیکی کی خاطر خود قربان ہو جائے تاکہ وہ مرد کامل کی شکل اختیار کر لے۔

حج کے اس عظیم الشان اجتماع میں اگر مختلف النوع اقوام کی نمائندگی کرنے والے تمام عاشقان توحید ایک منصوبہ بند پروگرام اور واحد مقصد کی راہ میں پیش قدمی اختیار کریں اور اس مقصد میں کامیابی کے لئے قربانی وفداکاری سے کام لیں اور دنیاوی بتوں کی تردید کے لئے ہر ممکن اسلحہ، چاہے سنگریزہ ہی کیوں نہ ہو، استعمال کریں تو اس میں کوئی دورائے نہیں کہ وہ تمام لوگوں سے بہتر ہوں گے۔

جس طرح یہ لوگ پتھر کی کنکریوں سے شیطان کو نشانہ بناتے ہیں۔ انھیں چاہئے کہ اندرونی اور بیرونی شیاطین کی تلاش کریں اور ان کو اپنے اسلحہ کا نشانہ قرار دیں تاکہ الٰہی امتحان میں مومنین کی طرح سربلندی حاصل کر سکیں۔

لیکن لاکھوں حیوانات کی قربانی کے سلسلے میں اکثر علماء وفقہاء اس مسئلہ پر غور فکر کرتے

رہے ہیں کہ حلال گوشت حیوان کی قربانی میں قربانی کے گوشت کے استعمال کو بھی مد نظر رکھا گیا ہے یا نہیں؟ کیا اہم اور حقیقی مصالح کی خاطر اس قسم کے مالی نقصان کو برداشت کیا جاسکتا ہے۔

قرآنی آیات اور روایات سے یہ ظاہر ہے کہ قربانی کے گوشت کے استعمال کو پوری طرح نگاہ میں رکھا گیا ہے۔

" فکلو منها واطعموا القانع والمعتر۔ کذلك سخرنها لکم لعلکم تشکروم۔(سورہ حج ۳۱)

پس اس میں سے خود کھاؤ اور آبرومند و قانع فقیر کو کھلاؤ۔ ہم نے ان حیوانات کو تمہارے لیے مسخر کردیا۔ اور تمہیں شکر ادا کرنا چاہیے۔

سورہ حج کی اس آیت سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ قربانی کی تکمیل کے لئے قربانی کے گوشت کو کھانا اور کھلانا لازمی ہے۔

☆☆☆☆☆

مبلغ اشتراک

فی کاپی: ۳۰ ؍روپیہ: سالانہ ۱۰۰ ؍روپیہ

نوٹ: فصلنامہ راہ اسلام مبلغ اشتراک طلبہ واساتذہ اور تحقیقی مراکز سے وابستہ افراد کے لیے صرف پچاس روپیہ سالانہ ہے۔

ڈرافٹ صرف

DIRECTOR, IRAN CULTURE HOUSE

کے نام اور

NEW DELHI

کے کسی بنک میں قابل ادائیگی ہو۔

واقعۂ عید غدیر

۱۰ھ میں جب رسالتمآبؐ نے حج کا ارادہ کیا تو لوگوں میں اعلان کر دیا گیا۔ چنانچہ مدینہ میں بڑی تعداد میں لوگ اس حج میں شرکت کے ارادہ سے جمع ہو گئے جس کو حجۃ الوداع، حجۃ الاسلام ، حجۃ الکمال اور حجۃ التمام کا نام دیا گیا [۱] ہجرت کے بعد سرکار دو عالمؐ نے یہی ایک حج کیا تھا۔ ۲۴ یا ۲۵ ذی القعدہ کو سرورانبیاءؐ نے غسل فرمایا، خوشبو لگائی اور لنگی اور ردا پہن کر پیدل روانہ ہوئے۔ دوشنبہ کا دن تھا۔ پیغمبرؐ کی ازواج بھی ہودجوں میں بیٹھ کر روانہ ہوئیں اور آپ کے اہل بیت بھی، تمام مہاجرین وانصار مشہور قبائل عرب اور غیر معروف افراد کے ساتھ پیغمبرؐ کی معیت میں روانہ ہوئے [۲]

جب پیغمبرؐ مدینہ سے نکلے ہیں تو ان دنوں مدینہ میں چیچک یا خسرہ کی بیماری پھیلی ہوئی تھی لہٰذا بہت سے لوگ سرکار دو عالمؐ کے ساتھ حج کے لئے نہیں جا سکے اس کے باوجود حضورؐ کے ساتھ مسلمانوں کی بڑی تعداد نے فریضۂ حج ادا کیا۔ اتنا مجمع تھا جس کی تعداد کے بارے میں اللہ ہی جانتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ آپ کے ساتھ نوے ہزار افراد تھے، ایک قول ہے کہ ایک لاکھ چودہ ہزار کا مجمع تھا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایک لاکھ بیس ہزار کی جمعیت تھی اور یہ قول بھی ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار کا مجمع تھا اور کہا گیا ہے کہ اس سے بھی زیادہ تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو سفر حج کے دوران حضورؐ کے ساتھ تھے، حاجیوں کی تعداد تو اس سے کہیں زیادہ تھی۔ اس لئے کہ مکہ والوں کے علاوہ کچھ لوگ یمن سے حضرت علیؑ اور ابو موسیٰ کے ساتھ آئے تھے [۳]

یکشنبہ کی صبح کو سرکار رحمت العالمین، یلملم پہونچے وہاں سے کوچ فرمایا تو رات کا کھانا "شرف السیالہ" میں نوش فرمایا، وہاں مغرب و عشاء کی نماز پڑھی اور چل پڑے اور صبح کی نماز "عرق الظبیۃ" میں ادا فرمائی اور "روحا" میں نزول اجلال فرمایا "روحا" سے روانہ ہوئے تو نماز عصر "منصرف" میں پڑھی وہاں سے کوچ فرما کر اثابہ میں پڑھی سہ شنبہ کی "صبح عرج" پہونچے اور "لحی جمل" میں جو حصہ "جحفہ" کی گھاٹی ہے حجامت بنوائی اور چہار شنبہ کو "سقیا" پہونچ گئے وہاں سے چل کر صبح کے وقت "ابوا" تشریف

فرماہوئے اور نماز صبح ادا کی "ابوا" سے چلے تو جمعہ کے دن "جحفہ" میں نزول اجلال فرمایا۔ شنبہ کو "قدید" یکشنبہ کو "عسفان" اور وہاں سے روانہ ہوکر جب غمیم پہونچے تو پیدل چلنے والوں نے صف در صف ہوکر تھکاوٹ کی شکایت کی آنحضرتؐ نے فرمایا آپ لوگ اتنا تیز چلیئے کہ جسے دوڑنا کہا جائے سب لوگوں نے ایسا ہی کیا تو اس میں انھیں راحت محسوس ہوئی دوشنبہ کو آپ "مر ظہران" میں تھے شام کے وقت وہاں سے روانہ ہوئے "سرف" میں سورج غروب ہو گیا لیکن آپ نے نماز مغرب اس وقت پڑھی جب مکہ میں داخل ہو گئے "ثنیتین" پہونچ کر آپ نے رات بسر کی اور سہ شنبہ کے دن آپ مکہ میں داخل ہو گئے ؎

مناسک حج پورا کرنے کے بعد جب آپ واپس ہوئے تو وہ سارا مجمع آپ کے ساتھ تھا۔

جب آپ اٹھارہ ذی الحجہ کو "جحفہ" "غدیر خم" کے مقام پر پہونچے جہاں سے مدنیوں مصریوں اور عراقیوں کے راستے الگ ہوتے ہیں تو خداوند متعال کی طرف سے جبرئیل امین یہ پیغام لے کر نازل ہوئے: "یاایھا الرسول بلغ ماانزل الیك من ربك "؎

اور آپ کو حکم دیا کہ علیؑ کو لوگوں کا امام مقرر فرمائیں اور ان کو بتادیں کہ ان کی ولایت اور اطاعت سب پر فرض ہے۔

جو لوگ آگے تھے وہ "جحفہ" کے قریب پہونچ چکے تھے۔ آگے بڑھ جانے والوں کو سرکار دوعالمؐ نے واپس بلوایا اور پیچھے سے آنے والوں کو اسی جگہ پر روکے رکھا۔ وہاں پانچ بڑے بڑے درخت تھے لوگوں سے کہا گیا کہ ان کے نیچے کوئی پڑاؤ نہ ڈالے۔ جب سب لوگ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے تو ان درختوں کے نیچے کی جگہ صاف کی گئی اس کے بعد نماز ظہر کے لئے اذان کہی گئی تو سرکار دوعالم ان درختوں کے نیچے تشریف لے گئے اور تمام لوگوں کو نماز پڑھائی۔

اس روز قیامت کی گرمی تھی۔ گرمی کی شدت سے بچنے کے لئے لوگ اپنی اپنی ردا کا کچھ حصہ پاؤں کے نیچے اور کچھ سر کے اوپر رکھے ہوئے تھے۔ درخت کے اوپر کپڑا ڈال کر سرکار دوعالمؐ کے لئے سائبان بنایا گیا۔

جب آپؐ نماز سے فارغ ہوئے تو قوم کے درمیان؎ میں اونٹوں کے پالانوں کے اوپر قیام فرماہوئے اور باآواز بلند خطبہ کا آغاز کیا تاکہ تمام لوگ سن لیں، آپ نے ارشاد فرمایا:

ہر تعریف اللہ کے لئے ہے ہم اسی سے مدد طلب کرتے ہیں اس پر ایمان لائے ہیں اور اسی پر بھروسہ کرتے ہیں اپنے نفوس کی شرارت اور اعمال کی برائی سے خدا کی پناہ چاہتے ہیں۔ اس خدا کی پناہ گاہ کہ جس کو وہ بہکاوے اس کو کوئی راہ ہدایت نہیں دکھا سکے اور جس کی وہ ہدایت فرمادے اس کو کوئی نہبہکا سکے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور محمدؐ اس خدا بندہ اور اس کا رسول ہے، امابعد:-

اے لوگو! اس لطیف خبیر نے مجھے خبر دی ہے ہر نبی اپنے پہلے والے نبی کی آدھی عمر کے برابر زندہ رہتا ہے مجھے عنقریب اپنے حبیب کی طرف سے بلاوا آنے والا ہے اور میں اس کی دعوت قبول کروں گا۔ بیشک میں بھی مسؤل ہوں اور تم لوگ بھی مسؤل ہو۔ اس سلسلے میں تم لوگ کیا کہتے ہو؟ سب نے کہا: ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے کار رسالت انجام دیا، نصیحت فرمائی اور مشقت اٹھائی ہے۔ پس خدا آپ کو جزائے خیر عطا فرمادے۔

آپ نے فرمایا: کیا تم لوگ گواہی نہیں دیتے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمدؐ اس کا بندہ اور رسول ہے جنت حق ہے دوزخ حق ہے اور قیامت برپا ہوگی جس میں کوئی شک نہیں اور خدا سب کو ان کی قبروں سے اٹھائے گا؟ سب نے کہا: جی ہاں ہم گواہی دیتے ہیں۔

آنحضرتؐ نے عرض کی: اے اللہ تو بھی گواہ رہنا!

پھر آپ نے فرمایا: اے لوگو! تم سب کے سب سن رہے ہو؟

سب نے کہا: جی حضورؐ ہم سن رہے ہیں۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: میں تم سے پہلے حوض کوثر پر پہونچوں گا اور تم میرے پاس حوض کوثر پر آؤ گے جس کی وسعت صنعا ۸ اور بصریٰ کے درمیانی حصہ کے برابر ہے اس میں ستاروں کے بقدر چاندی کے پیالے ہیں اب تم لوگ بتاؤ کہ میرے بعد ثقلین ۹ کے ساتھ کیا سلوک کروگے؟ کسی نے بہ آواز بلند پوچھا یا رسول اللہؐ! ثقلین سے کیا مراد ہے؟

سرکار دو عالم نے فرمایا: ثقل اکبر اللہ کی کتاب ہے جس کا ایک سرا خدا کے پاس اور دوسرا آپ کے ہاتھوں میں ہے اس کو مضبوطی سے تھامے رہو تو گمراہ نہیں ہو پاؤ گے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے، یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس پہونچ جائیں اور یہ بات میں نے ان کے

لئے اپنے پروردگار سے مانگی ہے۔ تم ان سے آگے نہ بڑھنا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے اور ان سے دور نہ ہونا ورنہ اس صورت میں بھی ہلاک ہو جاؤ گے۔

اس کے بعد آپؐ نے حضرت علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر ان کو اپنے ہاتھوں پر اتنا بلند کیا کہ دونوں کے بغلوں کی سفیدی نمایاں ہونے لگی اور تمام لوگوں سے علیؑ کا تعارف کرایا۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا "اے لوگو! مومنوں کے نفوس پر خود ان سے زیادہ کسے اختیار ہے؟ سب نے عرض کی اللہ اور اس کے رسولؐ تو بہتر جانتے ہیں۔"

سرکار دو عالم نے فرمایا: اللہ میرا مولا ہے اور میں مؤمنین کا مولا ہوں اور ان سے زیادہ ان کے نفوس پر اختیار رکھتا ہوں۔ پس جس کا میں مولا ہوں اس کا علیؑ مولا ہے آپ نے تین مرتبہ ارشاد فرمایا اور حنبلیوں کے امام امام احمد کے الفاظ ہیں کہ چار مرتبہ ارشاد فرمایا اس کے بعد دعا کی "اے اللہ تو دوست رکھ اسے جو علیؑ کو دوست رکھے اور دشمن رکھ اسے جو علیؑ کو دشمن رکھے محبت رکھ اسے جو علیؑ سے محبت رکھے اور مبغوض قرار دے اس کو جو علیؑ سے بغض رکھے۔ مدد کر اس کی جو علیؑ کی مدد کرے اور چھوڑ دے اس کو جو علیؑ کو چھوڑ دے اور جدھر علیؑ مڑیں حق کو ادھر موڑ دے جو لوگ حاضر ہیں وہ غائبین کو بتا دیں۔"

اس کے بعد ابھی لوگ اس جگہ سے دور نہیں ہونے پائے تھے کہ امین وحی الٰہی یہ آیت لے کر نازل ہوئے "**اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الاسلام ديناً**"

پس سرور دو عالم نے فرمایا (اللہ اکبر) دین کے اکمال، نعمتوں کے اتمام اور پروردگار عالم کے ان کی رسالت اور ان کے بعد علیؑ کی ولایت سے راضی ہونے پر تکبیر کہی تب لوگوں نے امیر المومنینؑ کو مبارک باد دینا شروع کیا۔ صحابہ میں سب سے پہلے حضرت ابو بکر اور حضرت عمر نے مبارک باد دی۔ ان کے الفاظ یہ تھے "اے ابن ابیطالب مبارک ہو آپ کو آپ میرے اور تمام مؤمنین و مومنات کے مولا ہیں۔ تب ابن عباس نے کہا ولایت لوگوں پر واجب ہو گئی۔

حسان نے عرض کی اے رسول خدا، مجھے اجازت دیجئے کہ میں علیؑ کی شان میں کچھ اشعار کہوں جنھیں آپ بھی سماعت فرمالیں۔

سرکار دو عالم نے فرمایا: کہو، خدا تمہیں برکت دے۔

حسان کھڑے ہوئے اور بولے اے بزرگان قریش میں اشعار سے پہلے اس ولایت کا اقرار کرتا ہوں جس کی رسولؐ نے گواہی دی ہے اسکے بعد کہا:

يناديهم يوم الغدير نبيهم بخم واسمع بالرسول مناديا

یہ تھا واقعہ غدیر بطور مختصر جس کا اعتراف پوری ملت اسلامیہ نے کیا ہے اور عالم اسلام اور روئے زمین پر اس کے علاوہ کوئی اور واقعہ غدیر نہیں اگر صرف اس دن کا نام ہی لیا جائے تب بھی اس سے الٰہی واقعہ سمجھ میں آتا ہے اور اگر اسکے مقام و محل کا ذکر آئے تو وہ الٰہی مقام ہے جو جحفہ کے قریب ہے کسی بھی محقق اور مؤرخ نے کسی اور واقعہ اور محل کی طرف حتیٰ اشارہ تک نہیں کیا ہے ۱۲

حوالہ جات:

۱۔ ہمارے خیال سے شاید "حجۃ الوداع" کو حجۃ البلاغ" کہنے کی وجہ خداوند عالم کا یہ ارشاد ہے "يا ايها الرسول بلغ ماانزل اليك من ربك..." اسی طرح اس حج کو حج آخر حج تمام اور حج کمال کہنے کی وجہ بھی قرآن کی یہی آیت "اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتي ..." ہے۔

۲۔ طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۲۲۵، امتاع مقریزی ص ۵۱۰، ارشاد الساری ج ۶ ص ۴۲۹۔

۳۔ السیرۃ الحلبیۃ ج ۳ ص ۲۸۳، سیرہ احمد زینی دحلان ج ۳ ص ۳، تاریخ الخلفاء ابن جوزی جزو رابع، تذکرہ خواص الائمۃ ص ۱۸، دائرۃ المعارف فرید وجدی ج ۳ ص ۵۴۲۔

۴۔ امتاع، مقریزی ص ۵۱۳، ۵۱۷۔

۵۔ مائدہ ۶۸۔

۶۔ مجمع الزوائد ج ۹ ص ۵۶ وغیرہ۔

۷۔ ثمار القلوب ص ۵۱۱ اور دوسرے منابع۔

۸۔ صنعا آجکل یمن کا مرکز اور بصریٰ دمشق کے اطراف میں ایک قصبہ ہے۔

۹۔ الثقل ث اور ق دونوں پر فتحہ جس کے معنی ہر عظیم اور نفیس شے کے ہیں۔

۱۰۔ مائدہ ۳

۱۱۔ اس قصیدے کے باقی ابیات "غدیر کی فضا میں" نامی کتاب کی چودہویں فصل میں ملاحظہ فرمائیے۔

۱۲۔ ڈاکٹر ملحم ابراہیم نے اپنی کتاب "تعلیقات علی دیوان ابی تمام" میں اس کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ واقعہ معروف جنگ کا ہے اور علامہ امینی نے اس کے بارے میں ایک طویل بحث کی ہے جس کو آپ "ترجمہ ابی تمام" چودہویں فصل میں پا سکتے ہیں۔

☆☆☆

ہندوستان میں فارسی زبان کی ترقی واشاعت

ایک مختصر تجزیہ

از: محمد حسن مظفری

در حقیقت بین الاقوامی قوانین اور ماحولیاتی مطالعات کا طالب علم ہونے کی وجہ سے میں بین الاقوامی روابط اور ماحولیاتی نقطۂ سے ادبی اور ثقافتی موضوعات کا مطالعہ و تجزیہ کیا کرتا ہوں اس میں کوئی شک نہیں کہ جملہ مخلوقات مثلاً جمادات، نباتات اور حیوانات ہی نہیں بلکہ ذہنی اور دماغی بیماری میں مبتلا انسان بھی محض مادی اور فطری وجود کے حامل ہوا کرتے ہیں اور صحیح و سالم انسانی وجود ان تمام مخلوقات سے مختلف اور نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ان تمام مخلوقات کے ساتھ ساتھ انسانی وجود کو اپنی نشو نما کے لئے فطری اور سالم ماحول کی ضرورت ہوا کرتی ہے لیکن انسانی وجود کے معنوی اور روحانی پہلوؤں کو فروغ دینے کے لئے، جنہیں انسان کی ''انسانیت ''کا نام دیا جاسکتا ہے، فطری سالم ماحول کے علاوہ معنوی اور روحانی ماحول کی ضرورت ہوا کرتی ہے جس کو عقیدہ واخلاق، ارزش واقدار، عشق و علم اور ادب و ثقافت کہا جاتا ہے اور یہی وہ معنوی اور روحانی ماحول ہے جس کی آغوش میں انسان کی شخصیت اور اس کی ''انسانیت'' پروان چڑھتی ہے۔

تاریخ کے دوران فکر و خیال اور ادب و ثقافت کے میدان میں انسان نے اپنی زندگی کے روحانی ماحول میں اور فرحت بخش نسیم کو پیغمبروں، اولیاء الٰہی، صالح بندوں اور دانشوروں کے سر و سینہ سے ٹکرا کر وسیع ولا محدود انسانی وشت میں چلتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے روح بخش نور کی شعاعوں کے سایہ میں بشریت کو ترقی کی منزلیں طے کر کے ''انسانیت ''کا رنگ و روپ اختیار کرتے دیکھا ہے لیکن اس مدت کے دوران کبھی کبھی اس پر کج فکری، فاسد اخلاقی اقدار، خود محوری اور ذاتی و جماعتی خود پرستی جیسی سیاہ اور منحوس ہوا کا سایہ بھی رہا ہے جس کی وجہ سے انسان کو بیماری اور رنج و مصائب کا بھی سامنا کرنا پڑا ہے۔

ایران وہندوستان بالخصوص اس ملک کے بندرگاہی شہر گجرات کو سالم عرفانی اور منفور وزہر آلود دونوں طرح کے ماحول کا سامنا رہا ہے۔ ثقافت وہنر اور فکر وادب کو بھی آب وہوا کی طرح نہ کبھی سیاسی وجغرافیائی سرحدوں کی شناخت رہی ہے اور نہ آئندہ ہوگی۔ صدیاں گزر گئیں لیکن یہ انسانی دنیا اپنی تمام عظمتوں اور بزرگیوں کے باوجود ایک "چھوٹے عالمی گاؤں" کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ ہندوازم وبودائیت اور عیسائیت واسلام ہوا کی لہروں کی طرح کبھی مشرق سے مغرب اور کبھی شمال سے جنوب کی طرف جاتے آتے رہے۔ مثال کے طور پر اشوک کے دور حکومت میں بودائی مذہب تقریباً پورے ہندوستان پر چھایا ہوا تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ یہ مشرق اور مغربی ایشاء کی طرف بڑی تیزی کے ساتھ قدم بڑھا رہا تھا۔ لیکن دوبارہ کچھ ایسے حالات رونما ہوئے کہ ہندوستان میں بودائی مذہب ناپید ہوگیا اور اس کی جگہ ہندوازم نے حاصل کرلی اور بودائی مذہب نے مشرقی ایشیاء کا راستہ اختیار کرلیا۔ اسی طرح مکاتب فکر بھی آتے جاتے رہے ہیں۔ بیسویں صدی کے دوران اشتراکیت کی مقبولیت کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا لیکن موجودہ دور میں اس کا غلبہ ختم ہوتا جارہا ہے۔ پس ثقافتی، مذہبی، ہنری، علمی اور فلسفی شعبوں میں رونما ہونے والی تبدیلیاں درحقیقت فطری ہیں اور آب وہوا میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی طرح انسان کے عرفانی اور معنوی ماحول حیات کو تبدیل کردیتی ہیں اور تبدیلی کا یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔ فکروہنری کی آمد ورفت میں آزادی انسان کے معنوی ماحول زندگی کے عوامل میں رونما ہونے والی دگرگونی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اس تدریجی وفطری تبدیلی کے ساتھ ہی ساتھ کبھی کبھی فطرت کی طرف سے ہونے والے حملات مثلاً فطری مصائب ومصیبت، سیلاب وطوفان وآتش فشاں وغیرہ کی وجہ سے انسان کو اپنی جگہ سے منتقل ہونا پڑا ہے اور ان فطری مصائب وآلام کی وجہ سے انسان بہر حال آوارہ وطن رہا ہے۔ بادشاہوں کے حملات اور کبھی کبھی بعض بادشاہوں کے ذریعہ مذہب اور قومیت کے ناجائز استعمال کو کسی قوم کے مذہبی اور ثقافتی کھاتے میں ہرگز درج نہ کرنا چاہئے۔

اکثر افراد یہ خیال کرتے ہیں کہ اسلام دنیا میں تلوار کے زور سے پھیلا ہے جبکہ جنوبی ومشرقی ہندوستان کے صوبوں، مالدیپ، الجزائر، انڈونیشیا، ملیشیا، چین کی مغربی سرحد اور افریقہ و امریکہ کے وسیع علاقوں میں کسی مسلمان سپاہی کے قدم نظر نہیں آتے ہیں، ان علاقوں میں اسلامی ثقافت کا وجود

انسانی زندگی کے ماحول میں روحانی اسباب وعوامل کی وجہ سے رونما ہونے والی فطری تبدیلیوں کا نتیجہ ہے۔ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ عشق اور عقیدہ کو نیزہ کی نوک یا تلوار کی دھار کے ذریعہ لوگوں کے دل میں جگہ دی جاسکتی ہے وہ در حقیقت غلطی پر ہیں۔ طاقت کے متوالوں اور ظالموں پر دل کے دروازے بند ہوا کرتے ہیں۔ قرآن مجید کا ارشاد گرامی ہے۔" لا اکراہ فی الدّین۔"بنیادی اعتبار سے دیکھا جائے تو دل، دین اور عقیدہ کسی قسم کی زبردستی کا متحمل نہیں ہے بلکہ اس کو بڑی سختی سے رد کر دیتا ہے۔ دل وہ تنہا قلعہ ہے جس پر نیزہ کی نوک، میزائل بارانی اور بم کے دھماکوں کے ذریعہ فتح نہیں حاصل کی جاسکتی ہے۔

اس آیۂ مبارکہ نے تو فقط ایک واقعہ کی خبر دی ہے لیکن طاقت کے سہارے یا ظلم وزیادتی کے ذریعہ کسی کے دل میں اسلام ایک طویل عرصہ تک باقی رہنے والا نہیں ہے۔ مثال کے طور پر آپ یونان کا حال دیکھ لیجئے جہاں مسلمان کئی صدیوں تک زندگی بسر کرتے رہے ہیں لیکن صورتحال یہ ہے کہ آج یونان کے مرکزی شہر ایتھنس میں کوئی مسجد موجود نہیں ہے جہاں لوگ فریضۂ نماز ادا کر سکیں۔ انسان کو جنگ وجدال اور قتل وغارتگری کے بجائے ہمیشہ ایسی فضا اور ایسے ماحول کی تخلیق وایجاد میں سرگرم رہنا چاہئے کہ انسان اس امن وسلامتی آمیز ماحول میں خوشحال زندگی بسر کر سکے اور اس کے لئے مادی ومعنوی ترقی کی راہیں بھی ہموار ہوں اور جنگ وخونریزی سے پرہیز اختیار کرتے ہوئے عدل وانصاف کی قربت کا شرف حاصل ہوتا رہے۔ مجموعی ہلاکت پیدا کرنے والے ایٹمی بایولاجیکی وکیمیاوی اسلحوں کی پیداوار بڑھانے والوں میں اتنی طاقت وصلاحیت کہاں ہوتی ہے کہ وہ امن وسلامتی کا ماحول پیدا کر کے پاک وپاکیزہ ماحول میں انسانوں کو پرامن زندگی بسر کرنے کا موقع فراہم کر سکیں۔

انسانی معاشرہ کو آج پہلے سے کہیں زیادہ حضرت پیر محمد شاہ اور مولانا رومی جیسی عارفانہ شخصیتوں کی ضرورت ہے۔ حضرت پیر محمد شاہ نے اپنی زندگی میں اعلیٰ انسانی قدروں کی عظمت وسربلندی کی راہ میں غیر معمولی کوشش انجام دی۔ انھوں نے انسانی روح کو آلودگیوں اور نجاستوں سے پاک وپاکیزہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی اور ان کی وفات کے بعد آج ان کی درگاہ سے وابستہ کتابخانہ واسپتال اور تعلیمی مراکز کے ذریعہ ضرورت مند طالب علموں کو وظیفہ وغیرہ کی فراہمی کے ذریعہ

انسانوں کے زخم پر مرہم رکھنے کی کوشش جاری ہے تاکہ انسانی معاشرہ علم کی برکتوں سے منور ہو جائے اور جہالت، ناخواندگی اور اخلاقی مفاسد و گندگی کا کام تمام ہو جائے مولانا روم نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ عارف حضرات آزاد منش ہوتے ہیں اور انسان کی معنوی و عرفانی زندگی میں یہ پانی کا کردار ادا کرتے ہیں۔

گرنبودی این پلیدیهای ما — کی بُدی این بارنامه آب را
یابریزد برگیاه رسته ای — یابشوید روی رونا شسته ای
یابگیرد برسراو حمّال وار — کشتیٔ بی دست وپا را در بحار
صد هزاران داروانِدروی نهان — زانکه هردارو بروید زو چنان
جان هر دُرّی دل هر دانه ای — میرود در جو چو داروخانه ای
زویتیمان زمین را پرورش — بستگان خشك را از وی روش

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران لاکھوں لوگوں کے قتل کے بعد عالمی سطح پر بہت سی تنظیمیں ابھر کر سامنے آگئیں حالانکہ تہذیب و تمدن کے اعتبار سے ان میں نقص بھی موجود تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد دائمی عالمی عدالت گاہ اور ادارہ اقوام عالم نامی دو بڑی تنظیمیں منظر عام پر آئیں اور دوسری عالمی جنگ کے بعد تنظیم اقوام متحدہ اور عالمی قانونی عدالت گاہ کی تشکیل عمل میں آئی۔ حال ہی میں بشریت کے خلاف جنگی جرائم کی روک تھام کے لئے نئی عالمی عدالتی تنظیمیں بھی بنائی گئی۔ جنگی جرائم کی ساعت کے لئے تشکیل شدہ عالمی عدالت گاہ کے آئین کو ممبر ممالک نے روم میں پاس کیا لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ دنیوی معاملات دوبارہ دوسری راہ پر لگے ہوئے ہیں اور چند صدی قبل کے انسان کی طرح "شکایت کرنے والے یعنی شاکی" فیصلہ کرنے والے قاضی اور فیصلے کو عملی جامہ پہنانے والے حاکم ان تینوں کے درمیان تال میل سا پیدا ہو گیا ہے اور اسی بنیاد پر عالمی دہشت گردی کی بھی بھرپور مذمت کی جارہی ہے اور یہ سب کچھ ایسے ماحول میں کیا جارہا ہے کہ جمہوریت و مدنیت کے دعویدار خود ہی جرم کے اسناد و مدارک فراہم کرتے ہیں، خود ہی فیصلہ کرتے ہیں، خود ہی حکم صادر کرتے ہیں اور خود ہی مجرم اور بے گناہوں کو ایک ساتھ سزا دے رہے ہیں۔ سزا بھگتنے والوں میں وہ لاکھوں افراد بھی شامل

ہیں جن کا جرم سے کوئی سروکار نہیں رہا ہے۔ کیا یہی عالمی تمدن اور جدید عالمی تمدن کی نمائش ہے؟ اور عملی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس بربریت اور دہشت گردی کے درمیان کیا فرق ہے؟ دنیائے بشریت کی اکثر مشکلات اور پریشانیوں کی بنیادی وجہ قومی علاقائی اور عالمی سطح پر اقوام عالم کے معاملات میں بڑی طاقتوں کی مداخلت ہے۔ درحقیقت بڑی طاقتیں چھوٹے ممالک اور وہاں کی ثقافت اور مذاہب و تمدن کو اپنے کھلونے کی طرح استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ درحقیقت گزشتہ نصف صدی سے مشرق وسطیٰ کے سینے پر اور گذشتہ دو دہائیوں سے مغربی اور مرکزی ایشیاء کے جسم پر جو زخم دکھائی دے رہے ہیں وہ انھیں مداخلتوں کا نتیجہ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ۲۰۰۱ء کو مختلف تمدنوں کے درمیان گفتگو کا سال قرار دینے کے بعد یونسکو کو ایک ایسے عالمی کنونشن کی تشکیل کا اہتمام کرنا چاہئے جس کے ذریعہ یہ دیکھا جاسکے کہ بڑی طاقتیں کس طرح اور کس حد تک دنیا کے مختلف مذاہب اور تمدنوں کو اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کی خاطر استعمال کر رہی ہیں اور اس عالمی کنونشن کے ذریعہ اس شرمناک حرکت پر فوری پابندی عائد کردی جانی چاہئے۔

ظہور اسلام سے قبل ہندو ایران تعلقات:

درحقیقت ظہور اسلام سے قبل ہندو ایران تعلقات کی نشاندہی رگ وید، اوستا اور دونوں ملکوں کی دیگر قدیم و باستانی کتابوں میں موجود داستانوں سے بخوبی ہو جاتی ہے۔ کلیلہ و دمنہ اور دیگر قدیم کتابوں میں جو داستانیں محفوظ ہیں ان کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی ولادت سے تقریباً دو ہزار سال قبل سے دونوں ملکوں کے درمیان ثقافتی روابط موجود تھے اور جب آریائی خاندان کے دو بڑے گروہوں نے مرکزی ایشیاء کے صحراؤں کو خیرباد کہتے ہوئے ایران اور ھندوستان میں سکونت کا فیصلہ کیا تو انمیں سے ایک جماعت سرزمین ایران اور دوسری جماعت ہندوستان میں آباد ہو گئی۔

رگ وید امین ایران کا ذکر اور اوستا میں ھند کا تذکرہ، فارسی اور سنسکریت کے درمیان مشترک الفاظ کی فراوانی، دونوں ملکوں کے باستانی ادب میں مشابہ داستانوں اور افسانوں کا وجود، پنچ تنتر نامی کتاب کا پہلوی زبان میں ترجمہ، بادشاہ ایران خسرو پرویز کے دربار سے پادشاہ دکن کے دربار میں سرکاری وفد کا آنا اور ''شطرنج'' نامی کھیل سے ایرانیوں کو متعارف کیا جانا وغیرہ ایسے امور ہیں جن کی

روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان اور ایران کے درمیان قدیم زمانہ سے ہی قریبی دوستانہ تعلقات موجود تھے۔

استاد رضا جلالی نائینی نے "اوپانیشاد" نامی کتاب کے مقدمہ میں، جس کا ترجمہ داراشکوہ نے کیا تھا اور جو ڈاکٹر تاراچند، سابق سفیر ہند در ایران کی خصوصی توجہ کے نتیجے میں زیور طبع سے بھی آراستہ ہو چکی ہے، تحریر فرمایا ہے کہ ہند و ایران کی قدیم زبانوں کے درمیان غیر معمولی مشابہت پائی جاتی ہے اور مشترکہ مفہوم و تلفظ کے حامل الفاظ بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں جن کو نگاہ میں رکھتے ہوئے بڑے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ دونوں زبانوں پر مکمل مہارت کے بغیر قدیم فارسی اور سنسکریت کا مطالعہ ناممکن ہے۔ دونوں زباونوں کے دستوری اور قواعدی ڈھانچے میں بھی زیادہ اختلافات نہیں پائے جاتے۔ دونوں موجودات کے درمیان مماثلت اور یگانگی زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ اوستا کے باطنی حصے میں ایسی ادبیات بھی پائی جاتی ہیں کہ تلفظ میں قدرے تبدیلی کے بعد دوتوں کو قابل فہم زبان میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال فارسی قدیم اور سنسکریت میں مشترکہ الفاظ کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ایسے ہزاروں الفاظ پائے جاتے ہیں جو ہندو آریائی خاندان کی زبانوں میں بالکل مفقود ہیں۔

ظہور اسلام کے بعد ہند و ایران تعلقات:

مذہب اسلام کے ظہور کے بعد ایران اور ہندوستان کے درمیان باہمی روابط میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ عربی زبان میں موجود نئے افکار و خیالات کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا اور اس دور کا ادب و ہنر عربی و اسلامی ثقافت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ ہنری و ادبی سرمایہ پورے مشرقی ایشیائی علاقے میں پھیل گیا۔ اکثر مورخین نے ہندوستان میں اسلام اور فارسی زبان کی آمد نیز اس کی وسعت و مقبولیت کے سلسلے میں محمد بن قاسم اور محمود غزنوی کے حملات کو غیر معمولی اہمیت دی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان دو حکمرانوں کے لگاتار حملوں کی وجہ سے اس علاقے میں اسلام اور فارسی زبان کا بول بالا ہو گیا۔ لیکن دونوں علاقوں کے درمیان تجارتی، ثقافتی اور لسانی روابط کی گہرائی و وسعت یہ دعوت فکر دے رہی ہے یہ فوجی کمانڈروں کے بس کی بات نہیں ہے یا کسی ایک زبان کے حاکموں کی حمایت و پشت پناہی کا نتیجہ نہیں ہے موجودہ اور ہندوستان میں یہ بات اور

زیادہ تاکید کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کیونکہ موجودہ حکمرانوں کو "قومی زبان" کی حیثیت سے کسی ایک مخصوص زبان کو پورے ہندوستان میں کیسی کیسی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

ایران عظیم جس کی مملکت کا دائرہ مغربی و مشرقی ایشیاء، مرکزایشیاء کے اکثر علاقوں نیز خلیج فارس تک پھیلا ہوا تھا اور جو مختلف جغرافیائی علاقوں کے درمیان ارتباطی پل کا کام انجام دے رہا تھا۔ اس زمانے میں آمدورفت اور حمل و نقل کے لئے دریائی اور ہوائی راستوں کی تحقیق نہیں ہوئی تھی پھر بھی عالمی سیاح جادہ ابریشم یعنی کا Silkroute استعمال کر رہے تھے اور ایران افراد کی نقل و حرکت اور سازو سامان کے حمل و نقل کے سلسلے میں ایک پل کی حیثیت رکھتا تھا اور فارسی زبان کو مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کے دانشمندوں کے درمیان رابطہ کی زبان کا درجہ حاصل تھا۔ ہندو چین، مشرقی ایشیاء کے افکار و عقائد ایک طرف اور مغربی یونانی و عرب دانشوروں کے نظریات دوسری طرف فارسی زبان کے ذریعہ دنیا کے مغربی اور مشرقی علاقوں میں ایک دوسرے کے ساتھ تبدیل ہو رہے تھے اسی وجہ سے فارسی زبان کو خصوصی اہمیت حاصل ہو گئی اور یہ زبان دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ پھلی پھولی۔ ہندوستان پر حکومت کرنے والے ترک زبان بادشاہوں نے اس زبان کی اہمیت اور پورے ہندوستان میں اس کی مقبولیت کو محسوس کرتے ہوئے اس سرکاری اور عمومی زبان کا درجہ عطا کیا تھا۔

بہر حال ہندوستان میں اسلام کی آمد سے قبل بھی فارسی زبان محدود دائرہ تک ہی سہی لیکن علاقے میں رابطہ کی زبان' کا کردار کر رہی تھی۔ ابومعشر خراسانی نے سفر ہند کے بعد علم نجوم پر جو کتاب لکھی ہے اور ابو منصور موفق بن علی ھروی نے "الابینہ فی الحقایق الادویہ" نامی کتاب در حقیقت ہندوستان میں لکھی گئی نثر لیکن فارسی کا بہترین نمونہ ہیں اور ان کتابوں سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلام کی آمد سے قبل بھی ہندوستان اور ایران کے درمیان گہرے ثقافتی روابط رہے ہیں اور یہ زبان اس علاقے میں Linguafraca کی حیثیت سے رائج رہی ہے اور اس نے مغل دور حکومت کے دانشمندوں اور شاعروں کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ اگر وہ اپنے اشعار کی مقبولیت اور اپنے علمی افکار و عقائد کی ترویج و اشاعت کے خواہاں ہیں تو فارسی زبان کا انتخاب کریں۔

☆☆☆☆☆

اسلام دہشت گردی کا نہیں، امن وسلامتی کا مذہب ہے۔

از: سید شمیم کاظم
ممبر قومی اقلیتی کمیشن حکومت ہند، نئی دہلی

درحقیقت اسلام وہ مذہب ہے جس نے ہمیشہ امن وسلامتی اور صلح وآشتی کا پیغام دیا ہے اور انسانی دنیا کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا ہے کہ دنیا کے بنانے والے نے اس دنیا میں جو کچھ بھی پیدا کیا ہے وہ سب کچھ انسان کے لئے ہے کیونکہ انسان ان تمام چیزوں میں سب سے زیادہ قیمتی اور اہمیت والا ہے وہ اشرف المخلوقات ہے۔ یہ زمین، یہ آسمان، یہ چاند، یہ تارے سب کچھ انسان کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ پس اگر انسان نہ ہو تو یہ دین ومذہب اور یہ آئین وقوانین سب بے سود ہو جاتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے اسلام کی مقدس کتاب قرآن نے خدا کو کسی جماعت ملک یا قوم سے نہیں جوڑا بلکہ رب العالمین کہا ہے اور پیغمبر عظیم الشان حضرت محمد مصطفیٰ ؐ کو بھی کسی ذات یا جماعت کے دائرہ میں محدود رکھنے کے بجائے رحمت العالمین کہا ہے۔ اور نسلی تعصب وبھید بھاؤ کو رد کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ اے انسانو! تمہارے درمیان اکرم یعنی "مہاتما" وہ ہے جو برائیوں سے سب سے زیادہ دوری اختیار کرتے ہوئے اپنے پالن ہار و پروردگار سے ڈرتا ہے۔

قرآن پاک کی سورہ مائدہ میں ایک مقام پر اسلام کو سُبُلَ السّلام کہا گیا ہے یعنی امن وسلامتی کا راستہ، اسی طرح دوسرے مقام پر سورہ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے لآ اِکراہ فِی الدّین یعنی دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ قرآن نے یہ اعلان کر کے صاف طور پر بتادیا ہے کہ مذہبی جارحیت سے اسلام کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام امن وسلامتی کو انسانیت کی فلاح وبہبود کے لئے بنیادی ضرورت قرار دیتا ہے اور اس کی قطعی اجازت نہیں دیتا کہ ایک انسان دوسرے انسان کے جان ومال پر حملہ کرے اگر کوئی انسان کسی کو قتل کر دے تو گویا اس نے سارے انسانوں کو قتل کر دیا اور اگر

کسی نے ایک جان کو بچالیا تو گویا اس نے سارے انسانوں کو زندہ بچالیا۔اس واضح بیان اور ارشادات نبویؐ کے بعد بھی کیا اس بات کی مزید وضاحت کی کوئی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ اسلام دہشت گردی کا نہیں امن وسلامتی کا مذہب ہے، نفرت وعداوت کا نہیں عشق ومحبت کا مذہب ہے، وہ ایک بے گناہ انسان کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیتا ہے اور اس بے گناہ کا مسلمان ہونا کوئی ضروری نہیں۔

پیغمبر اسلام کی حدیث ہے کہ اگر کوئی مرد مسلمان کسی ذمی یعنی غیر مسلم شہری کو اذیت پہونچاتا ہے تو قیامت کے میدان میں اس مرد مسلمان کے مقابلے میں، میں اس غیر مسلم کی حمایت کروں گا۔ کیا پیغمبر کے ان کھلے ہوئے بیانات اور قرآن کی آیات میں موجود حقائق کو دیکھنے کے بعد بھی اس پروپگنڈہ پر یقین کیا جاسکتا ہے کہ اسلام تشدد اور دہشت گردی کا مذہب ہے؟! سچ تو یہ ہے کہ اسلام اور تشدد دونوں میں غیر معمولی تضاد پایا جاتا ہے۔ جہاں اسلام کی شکل میں امن وسلامتی کا پیغام موجود ہو وہاں دہشت گردی کا گذر ہی نہیں ہو سکتا ہے۔

اسی طرح اسلام نے جنگ پر صلح کو ترجیح دی ہے۔ قرآن پاک کے سورۂ انفال میں بیان کیا گیا ہے "دیکھو اگر دشمن صلح کی طرف جھکیں تو تمہیں چاہئے کہ تم بھی اسی کی طرف جھک جاؤ اور ہر حال میں اللہ پر بھروسہ رکھو جو سب کی سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔ پیغمبر اکرم نے اپنے اللہ کے اسی فرمان کے پیش نظر اسلام کے دشمنوں کے ساتھ "صلح حدیبیہ" نامی معاہدہ کیا جس میں انہوں نے اپنے دشمنوں کی تمام شرطوں کو تسلیم کرتے ہوئے آج کی اصطلاح میں دب کر صلح کی تھی لیکن اللہ نے اسی صلح کو کھلی ہوئی فتح کے نام سے یاد کیا۔

انسانی تاریخ گواہ ہے کہ اسلام امن وآشتی اور صلح وسلامتی کا پیغام لے کر آیا ہے اور اس نے دہشت گردی کی نہیں بلکہ آدمیت کی علمبرداری کی ہے۔اس نے آج سے چودہ سو برس پہلے ہی یہ اعلان کر دیا تھا کہ اگر انسان واقعی "انسان کامل" کا درجہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کو ہر حال میں خوش اخلاق ہونا چاہئے کیونکہ حسن اخلاق قتل وغارتگری، لوٹ کھسوٹ اور بے گناہوں کے قتل عام کی نہیں بلکہ بات چیت اور گفتگو ومذاکرہ کے ذریعہ ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے کی دعوت دیتا ہے۔ ہمارے پیغمبر نے اپنے عمل سے جو پیغام دیا ہے وہ یہی ہے کہ جب صلح وآشتی کی ساری تدبیریں ناکام ہو جائیں اور

دشمن کے حملوں سے بچنے کا کوئی راستہ باقی نہ رہ جائے تو اپنے دفاع میں جنگ کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی زندگی میں دفاعی جنگیں ہی لڑی ہیں۔ اس کے علاوہ جو لوگ جہاد کے ذریعہ اسلام کے سلسلے میں غلط فہمی پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ شاید اس حقیقت کی طرف متوجہ نہیں ہوئے کہ اسلام کی نظر میں جنگ کے میدان میں دشمن کے مقابلے میں جو جہاد کیا جاتا ہے وہ سب سے چھوٹا جہاد ہے اور اپنے نفس یعنی "انتر اتما" کے خلاف لڑنے کو "جہاد اکبر" کا نام دیا گیا ہے۔ کیونکہ کھلے دشمن کا مقابلہ آسان ہوتا ہے اور چھپے دشمن سے لڑنا بہت مشکل۔

اسلام کسی کی جان مال یا عزت و آبرو پر حملہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ تشدد، سختی، قتل و غارتگری تو بہت بڑی بات ہے اس نے ہر قسم کے ظلم کی کھل کر مذمت کی ہے۔ مظلوم کو بدلہ لینے کا حق تو دیا ہے لیکن یہ سفارش بھی کی ہے کہ بدلہ لینا اور معاف کر دینا دونوں تمہارا حق ہے لیکن معاف کر دینے میں زیادہ لذت محسوس ہوتی ہے۔ اسلام کی نظر میں جنگ چھیڑنا ایک برا عمل ہے اسی وجہ سے کربلا کے میدان میں امام حسین علیہ السلام نے ہر طرح کے ظلم برداشت کئے لیکن لڑائی میں پہل نہیں کی اور جب دشمن کی فوج نے ان پر دھاوا بول دیا تو انہوں نے کربلا کے میدان میں اپنے آخری خطبے میں یہ اعلان کیا کہ "میں نے اچھی باتوں کے پرچار (امر بالمعروف) اور بری باتوں کی روک تھام (نَھی عَنِ المُنکر) کیلئے یہ عظیم قربانی پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

آخر وہ اسلام دہشت گردی کا ساتھ کیسے دے سکتا ہے جس کے دینی رہنما دہشت گردی کا شکار تو ہوئے ہیں لیکن دہشت گردی کو اسلام کا جز نہیں بننے دیا۔ اسلام نے عشق و محبت اور صلح و سلامتی کے جس پیغام کو انسان دوستی کا وسیلہ قرار دیا تھا اس کا تحریک تصوف نے اپنے مخصوص انداز میں پرچار کیا جو بعد میں رونما ہونے والے مذہبی رہنماؤں کی مقدس کتاب کا اٹوٹ حصہ بن گیا چنانچہ گرونانک کی "گُروانی" میں بابا فرید کی تعلیمات آج بھی مختلف مذاہب کی پیروی کرنے والوں کو آپسی میل جول اور پریم و محبت کا پیغام دے رہی ہیں۔

بات صرف مذہبی پیشواؤں کی تعلیمات ہی تک محدود نہیں بلکہ مختلف زبان و ادب کے نامور دانشوروں نے بھی اپنے مضامین اور اشعار کے ذریعہ اسلام میں موجود انسان دوستی کے پیغام کو لافانی

بنانے کی بھرپور کوشش کی ہے تاکہ دنیا ہمیشہ صلح وسلامتی کے اس پیغام سے فائدہ حاصل کرتی رہے۔ چنانچہ ظلم وبربریت اور انسانیت سوزی پر مشتمل دوسری جنگ عظیم کے بعد فاتح ملکوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اقوام متحدہ نامی تنظیم بنائی جائے جس کا مقصد یہ ہو کہ اب دنیا میں پھر ایسی جنگ رونما ہونے پائے اور اگر دنیا کے کسی گوشہ میں دو ملکوں کے درمیان جنگ کی صورتحال پیدا ہو جائے تو یہ تنظیم ان ملکوں کے درمیان صلح ومصالحت کی کوشش کرے۔ اس عالمی تنظیم کی تشکیل کے بعد تمام ممبر ملکوں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ اقوام متحدہ کی عمارت کے صدر دروازہ پر کوئی چھوٹا سا ایسا ادبی شاہکار کندہ کرادیا جائے جو کسی ملک وقوم دین ومذہب یا جغرافیائی علاقے کی نشاندہی کے بجائے صرف آدمیت کی بات کرتا ہو۔ دنیا کے ماہرین زبان وادب نے انتہائی غور وفکر کے بعد مبلغ انسان دوستی شیخ سعدی کے تین اشعار منتخب کیے جو آج بھی اقوام متحدہ کے دروازہ پر کندہ ہیں اور دنیائے علم ودانش کو یہ پیغام دے رہے ہیں کہ اسلام دہشت گردی کا نہیں بلکہ آدمیت اور انسان دوستی کا علمبردار رہا ہے۔ شیخ سعدی کے یہ اشعار ان کی مشہور زمانہ کتاب گلستاں میں موجود ہیں جس کا مفہوم یہ ہے۔

"آدم کی اولاد آدمی ایک جسم کے مختلف اعضاء کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ ان کی تخلیق وآفرینش ایک ہی جوہر سے ہوتی ہے۔ جب زمانہ جسم کے کسی ایک حصے کو اذیت پہونچاتا ہے تو سارے اعضاء بدن بے چین وبے قرار ہو جاتے ہیں۔ اگر تو کسی دکھی یا تکلیف زدہ آدمی کو رنجیدہ وغمگین دیکھ کر خود بھی رنجیدہ وغمگین نہیں ہوتا ہے تو یہ مناسب نہیں ہے کہ تیرا نام آدمی رکھا جائے۔

مجھے امید ہے کہ اسلام کا یہ پیغام ساری دنیا میں بالخصوص ہمارے ملک میں صلح وسلامتی اور امن وآشتی کا باعث ہوگا اور اسلام پر بے بنیاد الزام تراشی کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔

☆☆☆

درمدح مولائے کائنات امیر المومنینؑ علیہ السلام

از: ایس۔ایچ۔ایم۔حسینی

دل کے نگر میں نغمہ وآہنگ کس لئے
قرناکاشور دف کی صدا چنگ کس لئے
شہنائیوں کیساتھ یہ مردنگ کس لئے
یہ اقتباس زیست ہے گلرنگ کس لئے

دل نے کہا کہ آج یہ ساعت سعید ہے
اے بے خبر ولادیت حیدرؑ کی عید ہے

الجھے ہوئے ہو تم کہ خفی کیا ہے کیا جلی
سچ پوچھئے تو یہ بھی ہے افلاس آگہی
اے کم نگاہ دیکھ کبھی گل کی تازگی
نازاں ہے اپنے بخت رساپر کلی کلی

اک آئینہ ہے صنعت پروردگار کا
ہر پنکھڑی ورق ہے کسی شاہکار کا

نفس خدائے برتر وذیشاں ہیں بوترابؑ
دل کے افق کا نیر تاباں ہیں بوترابؑ
تابندگی زیست کا ساماں ہیں بوترابؑ
اس رحمت تمام کاداماں ہیں بوترابؑ

تہذیب فکر کے رخ روشن کی آب ہے
حیدرؑ ہے جس کا نام وہی بوترابؑ ہے

بحرالم میں جھنڈے کو گاڑا تھا وہ علیؑ
دشمن کو اک نگاہ میں تاڑا تھا وہ علیؑ
مرحب سے پہلوان کو پچھاڑا تھا وہ علیؑ
خیبر کے در کو جس نے اکھاڑا تھا وہ علیؑ

وہ اشجعِ جہاں جسے کہتے ہیں بوترابؑ
ان کی ثنا میں اتری ہے قرآں سی کتاب

سجدہ کو ان کے فیض سے رخشندگی ملے
افسردگیٔ زیست کو تابندگی ملے
مردے کو ایک قسم میں فقط، زندگی ملے
دل میں اگر ولا ہو تو پائندگی ملے

دنیا بفیض حب علیؑ کامیاب ہے
عقبٰی میں بھی ولائے علیؑ ہمرکاب ہے

لطف نہاں و سر خفی وجلی علیؑ
مشکل کشا و ساقیٔ کوثرؑ ولیؑ علیؑ
پیغمبر عطا و کرم ہاں وہی علیؑ
قرآن دل صحیفہ ایماں علیؑ علیؑ

جودوسخا ومہر مروت شعار ہے
دھو کا نصیریوں کو ہوا کردگار ہے

☆☆☆☆

ارض فلسطین کو بچاؤ

اشراق حمزہ پوری

جو مرد مجاہد ہو تو کچھ کرکے دکھاؤ
جیسے بھی ہو تم ارض فلسطین کو بچاؤ
اللہ کی آئے گی مدد آگے تو آؤ
اقصیٰ کو یہودی کے شکنجے سے چھڑاؤ
جو مرد مجاہد ہوتو کچھ کرکے دکھاؤ

اسلام کے دشمن ہیں، یہ ظالم ہیں خطرناک
ناپاک ہیں یہ ان کے ارادے بھی ہیں ناپاک
ہر چند کہ رکھتے ہیں یہ یواین او[1] پہ بھی دھاک
لاحول سے اولاد شیاطین کو بھگاؤ
جو مرد مجاہد ہوتو کچھ کرکے دکھاؤ

اللہ کی تکبیر ہو شمشیر علیؓ ہو
کفار کے سر ضربت ایماں سے اڑاؤ
مغرور ہیں یہ پست کرو ان کے گماں کو
یہ لشکر باطل ہیں انہیں جڑ سے مٹاؤ
جو مرد مجاہد ہوتو کچھ کرکے دکھاؤ

توحید کے متوالوں سے کہتاہے یہ قرآں
وحدت کے پرستاروں سے الحاد ہے لرزاں
کرسکتا نہیں کوئی مؤحد کو پشیماں
توحید کے نغموں سے ہر اک ظلم مٹاؤ
جو مرد مجاہد ہوتو کچھ کرکے دکھاؤ

۱-U.N.O

نشتر

اخلاق احمد آہن

جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

کیا لکھوں میں کیسے لکھوں، لکھوں تو دن رات لکھوں — کتنا کرم ہے، کتنی جفائیں، کیسے میں یہ بات لکھوں
لکھتے لکھتے بھول گیا میں، کیا لکھنا تھا، کیا لکھوں؟ — لکھا جو پہلے لوگوں نے، کیا میں وہ صفحات لکھوں
بدلا کیسے موسم، مسلم! ژالہ باری کی زد میں تم — نہیں ٹھکانہ تیرے سکوں کا، کیسے یہ آفات لکھوں
دل ہے زخمی، حس پژمردہ، ذھن پریشان اور ماؤف — ٹوٹے رشتے، پھوٹی قسمت، کیسے یہ صدمات لکھوں
بے سامانی، پیٹ پہ پتھر، تپتی دھرتی، دھوپ بھی سر پر — مگر تھے فاتح وہ ہر در پر، کیا ان کو جنات لکھوں
ہوا مخالف، وقت بھی دشمن، فتنے بھی اٹھے زوروں پر — پھر بھی حکم پیمبر، سر پر کیا ان کی میں بات لکھوں
دیکھو ذرا تم! نظر اٹھا کر، دولت، ثروت، لاؤ لشکر — یہ سب کچھ ہے، پھر بھی ذلت، کیا اس کو سوغات لکھوں
حکم الٰہی کے ہو منکر، سوا خدا کے سب کے نوکر — ہوئیں مسلط قومیں تم پر کیا ان کو بدذات لکھوں
تیرے رہبر عیش کے خوگر، تم سب ہو بس مست قلندر — کہہ دوں سچ تو لگے گا نشتر، کیسے میں یہ بات لکھوں
لٹتی ماں، بہنوں کی عصمت، ارزاں تیرے خون کی قسمت — اسکے بعد بھی خواب غفلت کیسے یہ ظلمات لکھوں
ارض پاک کی روتی مائیں، بوسنیا سے اٹھتی آہیں — پھر بھی ہم اپنوں کو ستائیں، کیا اس کو حسنات لکھوں
تم نہ بنو دنیا پہ زحمت، تیرا وجود ہو باعث رحمت — ہم سب کو ہو شوق جنت اور میں یہ عادات لکھوں

پھر سے توبہ کرلو آہن! اور نہ بننا کبھی تو خائن
ہم سب کو جانیں پھر مومن، اور میں یہ حاجات لکھوں

مذہب اسلام کی عظمت وفضیلت

ڈاکٹراختر مہدی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

دنیا کے تمام نامور دانشوراس حقیقت کا اعتراف کرتے چلے آئیں ہیں کہ اسلام دنیا کا سب سے زیادہ اچھا مذہب ہے۔ اور الٰہی ادیان مذاہب کے درمیان اسلامی تہذیب وتمدن اور فرہنگ وثقافت کو گرانقدر وغنی ترین ثقافت کا درجہ حاصل ہے۔ اس مذہب کی فضیلت کے لئے اس سے بڑی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ خود خداوند عالم نے اس کو اپنا پسندیدہ دین کہہ کر متعارف کیا ہے۔ اس میں وہ سبھی صفات اور خوبیاں جمع کردی ہیں جن کے سایہ میں قیامت تک جنم لینے والی انسانی نسل کامیاب اور ہدایت یافتہ زندگی بسر کرتی رہے گی اور اسلام آئندہ نسل کے جملہ انسانی تقاضوں کو بخوبی پورا کرتا رہے گا۔ شائد اس دین مبین کی غیر معمولی مقبولیت ہی کی وجہ سے اس کے دشمنوں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ یہ مذہب عرصۂ دراز سے ظالموں کے وحشیانہ مظالم اور معاندانہ سرگرمیوں کا نشانہ بنا ہوا ہے اور تاریخ کے دامن میں اسلام دشمن حملات اور ان حملات کے مقابلے کا تذکرہ جگہ جگہ محفوظ ہے اور اس دعویٰ کی دلیل یہ ہے کہ خود پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں آنحضرت اور یہودی وعیسائی علماء کے درمیان مباحثات ومناظرات ہوئے۔ یہاں تک کہ ایک ایسا وقت بھی آیا کہ دونوں کے درمیان مباہلہ کی نوبت بھی آگئی۔ بہر حال پیغمبر نے اسلام دشمن حملات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور مختلف جنگوں میں اسلام کے نمایاں اور اعلانیہ دشمنوں کو شکست دیتے ہوئے فتح مکہ کے موقع پر اپنی کامیابی کا اعلان کرتے ہوئے دشمنوں کو یہ باور کرادیا کہ اسلام کو بظاہر شکست نہیں دی جاسکتی ہے اور فقط مکر وفریب اور منافقانہ ہتھکنڈوں کے ذریعہ ہی فرزندان اسلام کو شکست دی جاسکتی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے اسلام کی اس غیر معمولی عظمت وفضیلت ومقبولیت کا راز کیا ہے۔ جی

ہاں! اس الٰہی مذہب کی مقبولیت کا اہم ترین راز یہ ہے کہ اس نے انسانی قدروں کا بھر پور احترام کرتے ہوئے ساری دنیا کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرنے کی بھر پور کوشش کی کہ دنیا کی تمام مخلوقات میں انسان اشرف المخلوقات ہے۔ کائنات کی یہ انجمن انسانوں کے لئے ہی سجائی گئی ہے۔ شائد یہی وجہ ہے کہ اسلام کی مقدس کتاب قرآن پاک نے خداوند عالم کو کسی مخصوص ملک یا جماعت کا خدا نہیں بتایا کہ بلکہ رب العالمین کہا۔ا قرآن کو محض مسلمانوں کی ہدایت ورہنمائی کا سبب قرار نہیں دیا بلکہ پوری دنیائے بشریت کے لئے مشعل ہدایت قرار دیا۲ اور اپنے پیغمبر کو بھی عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا۔۳ صرف یہی نہیں بلکہ اس مذہب کے فرائض کی ادائیگی میں بھی انسانی قدروں اور انسانی فطرت کے تقاضوں کی تکمیل کا پورا پورا خیال رکھا۔ جب نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا تو محمود و ایاز کو ایک صف میں کھڑا کر کے یہ بتایا کہ بارگاہ عالیہ خداوندی میں تمام لوگ یکساں ہیں۔ جب روزہ کا حکم دیا گیا کہ اے ایمان والو! تم لوگوں پر روزہ واجب قرار دیا گیا بالکل اسی طرح جیسے تم سے پہلے کے لوگوں پر واجب تھا۴ اور جب حج کے لئے دعوت دی تو تو حکم ہوا کہ ہماری بارگاہ میں آرہے ہو تو دنیوی تزک بھڑک اور اس کی رنگینیوں اور رعنائیوں سے کنارہ کشی اختیار کرنی ہوگی۔ بیش قیمت اور فاخرہ لباس کا ہماری بارگاہ میں کوئی گزر نہیں ہے۔ بلکہ دو کپڑوں سے اپنے جسم کو چھپا کر یہ کہتے ہوئے چلے آؤ کہ معبود تو نے بلایا تو ہم تیری بارگاہ میں حاضر ہیں۔۵'' غور طلب امر یہ ہے کہ جب نماز کا حکم دیا گیا تو بالکل اسی لہجے میں زکوٰۃ کی بات کہی گئی۶ جب روزہ کا حکم دیا تو روزہ داروں کو بھوکا رکھ کر بھوکے غریبوں اور مسکینوں کی احوال پرسی کی ہدایت دی گئی اور جب حج کا حکم آیا تو استطاعت کی سپر ساتھ آئی کہ غیر مستطیع افراد کو فریضۂ حج ادا نہ کرنے کا صدمہ نہ ہو۔

مذہب اسلام کی عظمت و فضیلت کا دوسرا اہم راز یہ ہے کہ یہ دین سابقہ ادیان و مذاہب کی تردید و نفی نہیں کرتا ہے بلکہ اپنے سے پہلے کی شریعتوں کی خوبیوں کو اپناتے ہوئے خرابیوں اور بد عنوانیوں کو منسوخ قرار دیتا ہے اور لوگوں کو یہ دعوت دیتا ہے کہ اسلامی شریعت کا بغور مطالعہ اور بھر پور تجزیہ کریں اور بھر پور عقل و شعور کے ساتھ اسلام قبول کریں۔ پتہ یہ چلا کہ جملہ خواہشات کے ساتھ معبود حقیقی کی بارگاہ میں سر تسلیم خم کر دینے کا نام ہے اسلام۔ اور سر تسلیم خم کرنا یقین ہے۔

یقین تصدیق اعتراف ہے۔اعتراف فرض کی بجا آوری ہے اور فرض کی بجا آوری عمل ہے۔[8]

جب اسلام قبول کرلیا تو پھر اب آپ کی ذاتی خواہش، دیرینہ عادت اور قبائلی وخاندانی روایت کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہ جاتی بلکہ اپنی تمام عادتوں اور روایتوں کو اللہ کی خواہش وخوشنودی کے سانچے میں ڈھالنا لازمی اور شرعی اصطلاح میں واجب ہے۔اب یہ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ اسلام کی فلاں بات تو ٹھیک ہے لیکن فلاں بات کو طبیعت قبول نہیں کرتی ہے بلکہ طبیعت کو یہ سمجھانا پڑے گا کہ چونکہ اس کام کو اسلامی شریعت ممنوع قرار دیتی ہے اس لئے ہمیں یہ نہیں کرنا ہے چاہے بظاہر اس میں فائدہ ہی فائدہ نظر آتا ہو بلکہ مسلمانوں کو اس بات پر مکمل عقیدہ و ایمان رکھنا چاہے کہ اسلام نے صرف انہیں اعمال وافعال کو غیر شرعی قرار دیا ہے جس میں نبی نوع انسان کا نقصان ہے اور ایسے کسی کام سے نہیں روکا گیا جس میں نبی نوع انسان کا ذرہ برابر بھی فائدہ ہو۔یہ الگ بات ہے کہ ہماری محدود بصیرت والی آنکھیں پوشیدہ نفع و نقصان کو دیکھ نہیں پاتیں اور ہماری محدود عقل رموز خلقت سے کیسے آشنا ہو سکتی ہے۔

اسلام کی سب سے بڑی عظمت وفضیلت یہ ہے کہ اس کے جملہ اعمال و فرائض میں انفرادیت اور اجتماعیت کا سنگم نظر آتا ہے۔پنجگانہ نماز ادا کرنا ہر مسلمان کا بنیادی فریضہ ہے لیکن ان نمازوں کو باجماعت ادا کیا جائے تو اس کی فضیلت میں اضافہ اور بارگاہ عالیہ خداوندی میں اس کی قبولیت کا امکان بڑھ جاتا ہے۔یومیہ نمازوں کو مقامی مسجد میں پڑھا جاسکتا ہے لیکن جمعہ کی نماز کا جامع مسجد میں ادا کرنا باعث فضیلت قرار دیا گیا ہے اور اسی طرح عید الفطر کی نماز کو اور زیادہ بڑی اور وسیع جگہ پر (عید گاہ میں) پڑھنا فضیلت کا باعث ہے.جی ہاں! پنجگانہ نماز میں نمازیوں کی تعداد محدود ہوا کرتی، جمعہ کی نماز جماعت میں پورے محلے کے لوگوں کا اجتماع نظر آتا ہے اور عید الفطر کے موقع پر علاقے اور اس کے اطراف کے لوگوں کا اجتماع دکھائی دیتا ہے اور حج کے موقع پر یہ اجتماع بین الاقوامی اسلامی اجتماع کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ہر حاجی انفرادی طور پر حج کے جملہ اعمال و فرائض انجام دیتا ہے لیکن عالمی اسلامی برادری کے مفاد و مصالح کو نگاہ میں رکھنا بھی اس کا اہم فریضہ ہے۔یومیہ نمازوں کے دوران جماعت میں شریک ہونے والے افراد کی بہبودی و بہتری کے لئے کام کرنے کا موقع فراہم ہو جاتا ہے اور اگر بڑے پیانے پر

باہمی تعاون وامداد ممکن نہ ہو تو زبانی طور پر ایک دوسرے کی خوشی میں شریک ہو سکتے ہیں اور جماعت کے ساتھی کے غموں کو بانٹ سکتے ہیں اور آنے والے مصائب کا ڈٹ کر اور متحدہ طور پر مقابلہ کر سکتے ہیں۔ نماز جمعہ کے دوران باہمی امداد و تعاون کا یہ دائرہ کچھ اور وسیع ہو جاتا ہے کیونکہ جمعہ کی جماعت میں پورے علاقے اور اس کے اطراف میں آباد سبھی لوگ موجود ہوتے ہیں۔ شائد یہی وجہ ہے کہ جمعہ کے خطبے کو نماز کا جز قرار دیتے ہوئے اسے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور دوسرے حصے میں حالات حاضرہ پر اظہار خیال کے لئے تاکید کی گئی ہے اور خطبے کا یہ دوسرا حصہ اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ امام جمعہ کا دائرہ اختیار محض مسجد کی چہار دیواری تک محدود نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے سماجی مسائل و معاملات سے بھی اسے پوری طرح آگاہ رہنا ہے۔ ظاہر ہے کہ نماز عیدین اور حج بیت اللہ الحرام کے موقع پر دائرہ کار میں رونما ہونے والی وسعت عالمی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

واضح رہے کہ اسلام دشمن طاقتوں نے طلوع اسلام سے لیکر آج تک ہمیشہ انہیں اسلامی اعمال وعقائد کی تنقید نہیں بلکہ مذمت کی کوشش کی ہے جو یا تو دیگر ادیان و مذاہب میں موجود نہیں ہیں اور اگر ہیں تو ان میں اسلام جیسی عظمت وفضیلت موجود نہیں ہے جیسے مرد وزن میں مساوات، سیاست ودیانت شادی وطلاق اور جہاد وشہادت وغیرہ۔

اس حقیقت سے سبھی لوگ واقف ہیں کہ بعض مذاہب کی اسلام سے دیرینہ عداوت رہی ہے اور فرزندان توحید نے میدان جنگ میں ان اسلام دشمن طاقتوں کو اس پسندیدہ9 دین مبین کے عروج کے ابتدائی مراحل ہی میں ایسی شرمناک شکست سے دوچار کر دیا تھا کہ ان طاقتوں نے حیات نبوی کے دوران ہی اسلام کی عداوت میں نفاق جیسے اسلحے کا استعمال شروع کر دیا تھا چنانچہ مدینہ سے پیغمبر کی مختصر سی غیر حاضری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان اسلام دشمن طاقتوں کے نمائندوں نے مسجد نبوی کے مقابلے میں ایک بڑی اور وسیع مسجد کی تعمیر کا کام مکمل کر لیا اور جب پیغمبر اکرمؐ جنگ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد مدینہ واپس تشریف لائے تو منافقین کی اس جماعت نے ان کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اللہ کے رسول! ہمارے بزرگوں کو طولانی راستہ طے کر کے مسجد نبوی تک آنے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے لہٰذا ان کی سہولت کی خاطر ہم لوگوں نے اپنے محلے میں ایک مسجد تیار کر لی ہے اور اس

بات کے منتظر ہیں کہ آپ اس مسجد کا افتتاح فرمادیں۔ پیغمبرؑ نے اپنے اصحاب اور سپاہیان توحید کو حکم دیا کہ اس مسجد کو فوراً گرادیں اور وہ مسجد جس کا ذکر تاریخ کے صفحات میں ''مسجد ضرار''۱۰ کے نام سے آج بھی محفوظ ہے، پیغمبر کی نگاہوں کے سامنے مسمار کردی گئی۔ اس واقعہ کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کی کسی بھی بڑی طاقت میں اسلام کے خلاف اعلانیہ جنگ کرنے کی صلاحیت باقی نہیں ہے کیونکہ پیغمبر اکرمؐ اپنے دور میں ان طاقتوں کا سر کچل چکے ہیں البتہ منافقانہ راہ وروش کے ذریعہ اسلام کی رسوائی اور مسلمانوں کی سرکوبی کا بازار گرم کیا جاسکتا ہے۔ دین اور سیاست کے درمیان جدائی کا نعرہ بلند کرتے ہوئے موقع آنے پر سیاسی اغراض ومقاصد کی خاطر دنیا کے بڑے ایوانوں میں رمضان کے مقدس مہینے میں ''افطار پارٹی'' کا بھی اہتمام کیا جاسکتا ہے، پیغمبر اکرمؐ کی شان میں نام نہاد مسلمانوں کے گستاخانہ بیانات کے ذریعہ ان کے کردار کو داغدار بنانے اور نوجوان نسل کو اپنے پیغمبر سے بدگمان کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ مسئلہ طلاق کے ذریعہ اسلام کا مزاق اڑایا جاسکتا ہے اور آخری مرحلہ میں ہلاکت ودہشت گردی کو جہاد وشہادت جیسے اہم اعمال کا نام دیکر اقوام عالم کو اسلام سے متنفر کرنے کی سازش کی جاسکتی ہے۔ واضح رہے کہ شہادت وہ مقدس الٰہی افتخار ہے جو اتنی آسانی سے حاصل ہونے والا نہیں ہے اور خود کو ہلاکت میں ڈالنے کا نام جہاد نہیں ہے۔ یہ جان بالخصوص نوجوانان امت کی جان بہت قیمتی چیز ہے لہٰذا قوم کے دانشور طبقے کا فریضہ ہے کہ جہاد وشہادت جیسے اہم موضوعات کی بھرپور وضاحت کے لئے پیش قدم ہوں تاکہ خدا کی راہ میں اور محض ذات باری تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے کی جانے والی نبرد آزمائی کو ہی جہاد کا نام دیا جائے اور دہشت گردی اور آدم کشی پر مشتمل واقعات کو جہاد کے نام سے موسوم کرکے اسلام کی ذلت ورسوائی کی کوشش نہ کی جاسکے اور جان کو ہلاکت میں ڈالنے والے اعمال کو شہادت کے نام سے نہ یاد کیا جاسکے بلکہ فقط بامقصد سرخ موت کو ہی شہادت کہا جائے۔ جو طاقتیں مسجد کی تعمیر کے ذریعہ مسلمانوں کے پیغمبر کو دھوکا دینے کی کوشش کرسکتی ہیں وہ اس پیغمبر کی امت کے نوجوانوں کو جہاد وشہادت کا مفہوم میں قدرے انحراف پیدا کرکے انہیں اپنے مہلک ہتھکنڈوں کا شکار بھی بناسکتی ہیں۔

حوالے:

۱۔ سورۂ فاتحہ آیہ ۲	۲۔ سورہ بقرہ آیت ۳
۳۔ سورہ انبیاء آیت ۱۰۷	۴۔ سورہ بقرہ آیت ۱۸۳
۵۔ لبیک اللھم لبیک...	۶۔ سورہ بقرہ آیت ۴۳و ۸۳
۷۔ آل عمران آیت ۹۷	۸۔ نہج البلاغہ، کلمات قصار ۱۲۵
۹۔ آل عمران آیت ۱۹	۱۰۔ سورہ توبہ آیت ۱۰۷

☆☆☆☆

اپیـــــل

قارئین کرام!

بعض ناگفتہ بہ اسباب و عوامل کی وجہ سے ماہنامہ راہ اسلام کی اشاعت کا سلسلہ ایک مدت تک منقطع رہا اب اسے "فصلنامہ" کی شکل میں آپ کی خدمت میں پیش کیا جارہاہے اور زیر نظر شمارہ اپنی نوعیت کی چوتھی پیشکش ہے جس کی کامیابی و ناکامی کا فیصلہ آپ لوگوں پر ہے۔ سر دست مقالہ نگار دانشمندوں اور شاعروں کی خدمت میں یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ وہ اپنی غیر مطبوعہ اسلامی ادبی اور علمی تخلیقات کی طرح زیر نظر پتہ پر ارسال فرمائیں۔ شعراء و مقالہ نگار حضرات کا مناسب اعزازیہ ان کی ادبی تخلیق کی اشاعت کے بعد ان کے پتہ پر ارسال کر دیا جائے گا۔

محمد حسن مظفری

ایڈیٹر

"فصلنامہ راہ اسلام"

۱۸۔ تلک مارگ، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۱

ہجرت سے کامیابی تک

انقلاب کی کہانی

امام خمینیؒ کی زبانی

۱۹۷۹ء میں عظیم الشان انقلاب اسلامی ایران نے رہبر عظیم الشان امام خمینیؒ کی مثالی قیادت ورہنمائی میں کامیابی کی منزلیں طے کرلیں اور مظلوم وستم رسیدہ ایرانی عوام، مکمل آزادی واستقلال کے ماحول میں ملک وملت وترقی میں سرگرم ہوگئے اور خداوندعالم کا لاکھ لاکھ شکر واحسان کہ گزشتہ دودہائیوں کے دوران پرچم اسلام کے سایہ میں ایران نے عالمی سامراجی طاقتوں کی مہلک سازشوں کے باجود جو نمایاں کامیابیاں حاصل کی ہیں، انہیں دیکھ کر ساری دنیا حیران ہے۔

لیکن کم ہی لوگوں کو یہ حقیقت معلوم ہے کہ اسلامی انقلاب کا یہ گرانقدر سرمایہ، ایرانی عوام اوران کے قائد عظیم الشان کی اہم اور گرانقدر قربانیوں کا نتیجہ ہے۔ شاہی حکومت ابتدائی مرحلہ میں ہی اس انقلاب کا گلا گھونٹ دینا چاہتی تھی، اسی وجہ سے اس نے ۱۹۶۳ء میں قائد انقلاب کی گرفتاری کے بعد ایرانی عوام کے وحشیانہ قتل عام کا بازار گرم کردیا اور دوسری طرف امام خمینیؒ کو جلاء وطن کردیا تاکہ ایرانی عوام قیادت ورہنمائی سے محروم ہوجائیں اور اس طرح اسلامی انقلاب کا قصہ تمام ہوجائے لیکن باطل کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا اور دور جلاوطنی میں بھی امام خمینیؒ ایرانی عوام کی رہنمائی کرتے رہے اور انہوں نے ملک وملت کی ایسی رہنمائی کی کہ آج دنیا کا ہر صاحب علم وذی شعور انسان ان کی قیادت کا لوہا مانتا ہے۔ امام امت نے اپنی جلاوطنی کی زندگی کی داستان خود اپنی زبان سے بیان فرمائی ہے جو ذیل میں پیش کی جارہی ہے۔

"میں، جو واقعہ رونما ہوا، اس کی داستان مختصر لفظوں میں بیان کر رہا ہوں۔ جب لوگ ترکی سے سرزمین عراق میں داخل ہوئے اور اس کے بعد نجف اشرف پہونچے تو حکومت کی طرف سے بھیجے گئے افسران بار بار آئے اور ہم لوگوں سے یہ کہا کہ یہ عراق آپ کا ہے اور آپ لوگ جہاں رہنا چاہیں رہیں۔ ہم لوگ آپ کی ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں۔ اس کے بعد عراق میں تبدیلی حکومت کا سلسلہ شروع ہو گیا اور یکے بعد دیگرے حکومتیں بدلتی چلی گئیں۔ بالآخر ایک طویل مدت تک ہم لوگ ہر ممکن انقلابی سرگرمیوں میں لگے رہے لیکن دھیرے دھیرے حکومت عراق نے ہماری راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنا شروع کر دیں۔

پہلے مرحلہ میں ہماری حفاظت کے بہانے کچھ لوگوں کو ہماری رہائش گاہ پر تعینات کر دیا گیا۔ ان لوگوں نے جھوٹ اور بے بنیاد پروپگنڈے شروع کر دئے کہ لوگ آپ لوگوں کو قتل کرنے آئے تھے بلکہ ایک مرتبہ تو ان لوگوں نے یہ اطلاع دی کہ تقریباً پچاس لوگ آپ کو قتل کرنے آئے تھے۔ میں نے کہا کہ ان لوگوں کی یہ بات سراسر جھوٹی ہے کیونکہ کسی کو خفیہ طور پر قتل کرنے کے پچاس لوگ نہیں آیا کرتے بلکہ خفیہ قاتلانہ حملے کے لئے ایک یا دو آدمی ہی کافی ہوا کرتے ہیں۔ بہر حال دھیرے دھیرے ہماری رہائش گاہ پر حفاظتی افسران کی تعداد بڑھتی چلی گئی اور یہ افسران ہم لوگوں کو یہی باور کراتے رہے کہ "ہم لوگوں کو آپ کی حفاظت وسلامتی مقصود ہے۔" لیکن میں شروع ہی سے اپنے بعض دوستوں سے یہ کہا کرتا تھا کہ معاملہ حفاظت و سلامتی کا نہیں ہے بلکہ یہ لوگ ہماری سرگرمیوں پر پوری اور کڑی نگاہ رکھنا چاہتے ہیں۔

دھیرے دھیرے وقت گزرتا رہا یہاں تک کہ ایک بار بغداد سے ایک اعلیٰ حفاظتی افسر میرے پاس آیا۔ ویسے وہ آدمی تو مناسب تھا لیکن اس کی باتیں تکلف اور بناوٹ پر مبنی تھیں مثلاً یہ کہ آپ لوگ جو چاہیں کریں۔ ہماری طرف سے کسی قسم کی کوئی ممانعت یا رکاوٹ نہیں ہے بلکہ ہم ہر طرح کی مدد کے لئے حاضر ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس اعلیٰ حفاظتی حاکم کے جانے کے کچھ دنوں بعد ایک دوسرے افسر آگئے۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ صاحب پہلے افسر سے زیادہ اونچے عہدے کے حامل ہیں۔ انہوں نے اپنی گفتگو کے دوران واضح لفظوں میں یہ فرمایا کہ چونکہ حکومت ایران سے ہماری حکومت کے کچھ

معاہدے ہیں اور ان معاہدوں کی وجہ سے ہم لوگ آپ کی موجودہ سرگرمیوں کو تحمل نہیں کر سکتے۔ پہلے دن اس اعلیٰ عراقی افسر نے شائد اتنا ہی کہا تھا لیکن دوسرے دن وہ دوبارہ آیا اور کہنے لگا کہ آپ کا کچھ لکھنا، منبر سے گفتگو کرنا اور ٹیپ ریکارڈنگ کے ذریعے ایرانی عوام تک کوئی پیغام ارسال کرنا حکومت ایران کے ساتھ ہمارے معاہدے کے خلاف ہے لہٰذا آپ کو یہ سارے کام بالکل نہ کرنا چاہئیں۔ میں نے ان سے کہا یہ میرا شرعی فریضہ ہے لہٰذا میں بیان بھی جاری کروں گا اور بوقت ضرورت منبر پر گفتگو بھی کروں گا۔ آپ لوگوں کی بھی جو ڈیوٹی ہے، وہ انجام دیجئے۔ اس کے بعد بھی عراقی افسر سے میری گفتگو جاری رہی اور آخر کار جو بات طے پائی وہ یہ تھی کہ میں کسی خاص جگہ میں دلچسپی نہیں رکھتا ہوں۔ میں اس جگہ چلا جاؤں گا جہاں لوگوں کی خدمت کر سکوں۔ میرے لئے یہ لازمی نہیں ہے کہ میں حتمی طور پر نجف میں ہی قیام پذیر رہوں۔ اس نے کہا کہ آپ جہاں جائیں گے وہاں آپ کو ان مسائل کا سامنا کرنا ہوگا یعنی آپ پر پابندی لگادی جائے گی۔ اگرچہ اس وقت میرے ذہن میں کوئی جگہ نہیں تھی اور میں نے اس سلسلے میں کبھی غور و فکر بھی نہیں کی تھی بیساختہ کہا کہ اس ملک سے باہر چلا جاؤں گا، میں پیرس چلا جاؤں گا جو ایک آزاد ملک ہے اور ایران کے دباؤ میں بھی نہیں ہے۔ میری بات سن کر وہ عراقی افسر ناراض تو ہوا لیکن بولا نہیں۔ اس وقت آقائے دعائی، جو آج سفیر ہیں، میرے ساتھ تھے اور ترجمانی کے فرائض انجادے رہے تھے۔ اسکے بعد میں نے دیکھا کہ یہ عراقی حکام، میرے دوستوں کے ساتھ بدسلوکی پر آمادہ ہیں۔ آقائے دعائی نے مجھ سے بتایا کہ وہ لوگ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ ان کے ساتھ تو لوگ کچھ نہ کریں گے لیکن جو ان کے ارد گرد جمع ہیں ان کی خیر نہیں ہے میں نے دعائی صاحب سے کہا کہ آپ میری خاطر جایئے اور ویزا لے آیئے۔ اس سے قبل بھی وہ چیف آف سیکورٹی کے پاس کاغذات لے گئے تھے تو اس نے یہ کہہ کر اجازت نہیں دی تھی کہ آپ مجھے ان سے بھڑانا چاہتے ہیں؟ لیکن اس بار ان لوگوں نے ملک چھوڑنے کی اجازت دے دی۔ ہم لوگ عراق سے شام جانا چاہتے تھے آخر میں یہ طے پایا کہ پہلے کویت چلا جائے اور وہاں دو ایک دن قیام کے بعد شام کی طرف روانہ ہو جائیں گے اور اس وقت بھی میرے ذہن کے کسی گوشہ میں یہ بات نہیں تھی کہ میں فرانس چلا جاؤں۔

بہر حال یہ طے پایا کہ دوسرے روز ہم لوگ صبح صادق نمودار ہونے سے قبل رہائش گاہ پر تعینات حفاظتی افسران کی نگرانی میں عراق سے باہر نکل جائیں۔ جیسے ہی میں اپنے دروازہ سے باہر نکلا آقائے یزدی مل گئے۔ وہ اسی وقت سے میرے ساتھ ہیں۔ ہم لوگ کویت کی طرف روانہ ہوگئے۔ جیسے ہم لوگ کویت کی سرحد کے قریب پہونچے، ہم لوگوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا گیا کچھ دیر تک وہ لوگ کویت 'ایران کے باہمی روابط کے سلسلے میں معلومات حاصل کرتے رہے۔ مجھے یاد نہیں کہ اس وقت کویت کے ساتھ ایران کے تعلقات تھے یا نہیں، تھوڑی دیر کے بعد اس افسر نے اطلاع دی کی آپ لوگ کویت نہیں جاسکتے ہیں۔ میں نے کہا: اس سے کہو کہ ٹھیک ہے ہم لوگ کویت نہیں جاتے البتہ ہم لوگوں کو کویت ہوائی اڈہ تک جانے کی اجازت دے دو۔ ہم لوگ وہاں سے کسی دوسرے جگہ چلے جائیں گے۔ اس نے کہا: نہیں، آپ جس جگہ سے آئے ہیں وہیں واپس جایئے۔ ہم لوگ دوبارہ عراق واپس آگئے۔ رات میں بصرہ میں رہے اور دوسرے دن بغداد چلے گئے۔ بصرہ میں ہی میں نے یہ طے کیا کہ کسی بھی اسلامی ملک میں نہ جاؤں تو بہتر ہوگا کیونکہ اسلامی ممالک میں سرگرمیوں پر رکاوٹ اور پابندی کا احتمال زیادہ تھا لہٰذا یہ طے پایا کہ ہم لوگ فرانس چلے جائیں۔ (اب مجھے یہ یاد نہیں رہ گیا کہ وہ بصرہ تھا یا بغداد) میں نے فرانس روانہ ہونے سے پہلے ایران کے نام ایک پیغام لکھا جس میں میں نے ان حالات کی وضاحت کی جن کی وجہ سے فرانس کی طرف قدم بڑھانا پڑا۔ ان لوگوں کو آگاہ کرتے ہوئے یہ لکھا کہ درحقیقت ہم لوگوں کا پیرس جانے کا ارادہ بالکل نہیں تھا لیکن ایسے مسائل پیدا ہوئے جس میں ارادہ کو کوئی دخل نہیں تھا۔ بہر حال جو کچھ تھا، جو کچھ ہے اور شروع میں جو کچھ ہوا، وہ سب مشیت وارادۂ خداوندی کے مطابق تھا۔ اب تک میں نے کوئی بھی چیز یا کوئی کام اپنی ذات کے لئے انجام نہیں دیا اور نہ ہی تم لوگوں کے لئے کسی چیز کا قائل ہوں بلکہ ہر چیز و عمل میں مرضی معبود ہی مقصود رہی ہے۔ جو کام انجام پارہے ہیں وہ ہرگز ہمارے ذہن میں نہیں آئے تھے کہ مثلاً یہ کام اس طرح ہونا چاہئے تھا بلکہ کام خود ہو جاتا تھا اور ہم یہ دیکھتے تھے کہ وہ نتیجہ کا حامل ہے۔ ابھی جب ہم تہران آرہے تھے اور ہمارے ساتھ لوگ وزیر کی حیثیت سے موجود تھے، ملک میں لوگوں نے فوجی حکومت کا اعلان کردیا۔ میں اس بات سے بالکل ناواقف تھا کہ فوجی حکومت کا اعلان کیوں کیا گیا ہے، بعد میں لوگوں نے مجھے بتایا۔ لیکن

میرے ذہن میں یہ آیا کہ ہم لوگوں کو اس فوجی حکومت کو توڑ دینا چاہئے۔ چنانچہ ان لوگوں نے یہ اعلان کیا کہ آج ظہر کے بعد سے ملک میں فوجی حکومت نافذ ہو جائے گی۔ میں نے لکھا اور عوام نے اسے توڑ دیا اور بعد میں ہم لوگوں کی سمجھ میں آگیا کہ یہ سازش تھی اور اس فوجی حکومت کا مقصد یہ تھا کہ یہ لوگ سڑکوں پر تعینات ہو جائیں اور ان کے مقرر کردہ افسران رات کی تاریکی میں فوجی بغاوت کے بہانے ہمیں اور آپ لوگوں کو ہلاک کر ڈالیں۔ یہ سب کچھ بھی خداوند عالم نے کیا۔ لوگوں کے ذہن میں بھی نہیں آیا تھا کہ اس فوجی حکومت کا مقصد و منصوبہ کیا تھا۔ ہم لوگوں نے تو اس خیال کے تحت اس کی مخالفت کی تھی کہ ملک میں اس طرح فوجی حکومت کا اعلان نہ کیا جانا چاہئے، اس کی مخالفت کی تھی اور لوگوں سے اپیل کی تھی کہ اس کی مخالفت کریں۔ جب لوگ پیرس میں داخل ہوئے تو وہاں موجود لوگوں اور دوستوں نے ہمارے ساتھ غیر معمولی خلوص و محبت سے کام لیا۔

پیرس میں بھی ایک جگہ تھی جس کے بارے میں میں نے کہا کہ یہ جگہ ہم لوگوں کے لئے مناسب نہیں ہے لہٰذا ہم لوگ قریب کے کے گاؤں میں چلے گئے اگرچہ وہاں بھی ڈھیر ے ڈھیرے اطراف کے لوگ جمع ہو جایا کرتے تھے۔ ابتدائی مرحلوں میں حکومت فرانس قدرے احتیاط سے کام لیا کرتی تھی لیکن بعد میں ایسا نہیں تھا بلکہ وہ لوگ ہمارے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتے تھے اور ہم لوگ پیرس میں اپنے مطالبات کی تبلیغ واشاعت کے لئے پوری طرح آزاد تھے۔ کبھی امریکی خبر رساں ایجنسیوں کے نمائندے ہم سے ملاقات و گفتگو کے لئے آجایا کرتے تھے اور وہ لوگ مجھ سے کہا کرتے تھے کہ یہ انٹرویو پورے امریکہ میں اور دنیا کے دیگر ملکوں میں بھی شائع و نشر کیا جائے گا۔

ہم لوگ ایرانی مسائل کو اور ایران میں رونما ہونے والے حوادث و حقائق اور ملت ایران پر گزرنے والے واقعات کو اعلانیہ بیان کیا کرتے تھے۔ ایران کے باہر آباد ایرانی نوجوانوں اور دوستوں کی ٹولیاں بھی برابر مجھ سے ملنے آیا کرتی تھیں۔ وہ لوگ ہماری انقلابی سرگرمیوں میں برابر شریک رہا کرتے تھے اور اکثر مذاکرہ و اجتماع کا اہتمام بھی کیا کرتے تھے۔ آخری مرحلہ میں جب ہم لوگوں نے ایران واپس آنے کا فیصلہ کیا تو بڑی شدت سے یہ کوشش شروع کر دی گئی کہ ہم لوگ ایران جانے کا ارادہ ترک کر دیں۔ البتہ اس سے پہلے بھی حکومت امریکہ اور ایرانی حکام کی جانب سے مقرر شدہ لوگوں

کی طرف سے، اس قسم کے پیغامات ملتے رہتے تھے اور بعض اوقات وہ لوگ خود ہی آ جایا کرتے تھے۔ مثلاً ایک شخص میرے پاس آتا تھا اور یہ کہتا تھا کہ میں تاجر ہوں اگر چہ ہم لوگ جانتے تھے کہ وہ سیاسی آدمی ہوا کرتا تھا، وہ گفتگو کے دوران مجھ سے یہ کہنے لگتا تھا کہ آپ ابھی ایران نہ جائیے۔ ابھی جلدی مت کیجئے۔ ابھی حالات سازگار نہیں ہیں۔ اس کے بعد وہ لوگ شاہ ایران کی حمایت کرنے لگتے تھے اور جب سابق شاہ، ایران سے چلا گیا اور بختیار شاہی حکومت کی ظالمانہ راہ وروش کا وارث حقیقی بن گیا تو اس وقت بھی بڑی شدت کے ساتھ یہ کوشش کی گئی کہ میں ایران جانے کا ارادہ ملتوی کر دوں۔ دنیا کے مختلف علاقوں سے میرے پاس برابر یہ پیغام پہونچنے لگے کہ ابھی آپ ایران جانے کا ارادہ نہ کیجئے۔ حکومت فرانس کے ذریعہ بھی مجھے یہ پیغام پہونچایا گیا کہ ابھی آپ ایران نہ جائیں اور اگر وہاں آپ پہونچ جائیں تو پورے ملک میں خون کی ندی بہنے لگے گی۔ بہر حال جب ان لوگوں نے مجھے ایران آنے سے روکنے کی کوشش میں تیزی اختیار کی تو مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی کہ میرے ایران جانے میں کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو لیکن ان لوگوں کا نقصان ضرور ہونے والا ہے کیونکہ اگر میرے سفر ایران سے ان لوگوں کو کوئی فائدہ ملنے والا نہ ہوتا اور ان میں اتنی طاقت ہوتی کہ ایران پہونچتے ہی یہ مجھے گرفتار کر لیں گے تو پھر یہ لوگ ایسی باتیں نہ کرتے بلکہ یہ کہتے کہ آپ ایران آجائیے۔ بہر حال ہم پیرس سے ایران کی طرف چل پڑے اور ایران آگئے۔ در حقیقت خداوند عالم ابتدائے انقلاب سے لے کر آج تک تمام مسائل میں ملت ایران کے ساتھ تھا اور ملت ایران کے ساتھ سب سے بڑی تائید وحمایت خداوندی یہ تھی کہ انہیں براہ راست مقابلے سے منصرف رہنے کی توفیق عطا کر دی۔ اگر ان لوگوں نے موجودہ ملت افغانستان کی طرح براہ راست مقابلہ وٹکراؤ کی روش اختیار کی ہوتی تو یقیناً ہم لوگوں کو بھاری جانی اور مالی نقصانات کا سامنا کرنا پڑتا اور پورے ملک میں دار وگیر اور قتل وخون کا بازار گرم ہو جاتا۔ بہر حال خداوند عالم نے ظالموں کے دل میں غیر معمولی خوف وہراس اور رعب ودبدبہ پیدا کر دیا کہ براہ راست مقابلہ وصف آرائی کی نوبت ٹل گئی اور بحمد اللہ اب تک جو کچھ ہوا وہ ٹھیک ہی ہوا ہے۔ نقصان تو ہوا ہے لیکن کم ہوا ہے اور اس نقصان کے بعد ہم لوگوں کو جو چیز حاصل ہوئی ہے وہ یقیناً بہت زیادہ ہے۔

امام خمینیؒ ایک ناقابل فراموش ہستی

الف۔اے۔رحمانی

شاعر مشرق علامہ اقبال مرحوم نے ایک لافانی شعر کہا ہے

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

واقعات اور حالات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ شعر حضرت امام خمینیؒ کے مکمل حسب حال ہے۔ ہزاروں سال میں ایک ایسی عنقا شخصیت عالم وجود میں آئی ہے اور تیقن کے ساتھ یہ کہنا ناممکن ہے کہ آیا ایسی شخصیت دوبارہ بھی رونق افروز ہوگی یا نہیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں ہے۔

حضرت امام ایک دانشور تھے۔ عالم تھے۔ مذہبی رہنما تھے قابل رشک وسعت نظر کے حامل تھے اور وقوع پذیر ہونے والے حالات کا اندازہ بہت پہلے سے کر لیتے تھے۔ ۱۹۷۹ء سے پہلے کے ایران کو اسلامی مملکت کہنا ہی قطعاً غلط تھا۔ رضا شاہ پہلوی محض کٹھ پتلی بادشاہ تھے۔ ساری طاقت امریکہ کے ہاتھ میں تھی اور وہ اپنے پٹھوؤں کے ذریعہ اسے ایرانی عوام کے خلاف استعمال کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اسرائیل جیسے اسلام دشمن ملک سے ایران کے خاص اور قریبی تعلقات تھے جو کسی اسلامی ملک کے لئے ناقابل فہم اور باعث شرم تھا۔

امام خمینیؒ مرحوم کی ایک ایک سانس خدا، اس کے رسول اور شہداء کربلا کے نام وقف تھی۔ ہر لمحہ امت اسلامیہ کی فلاح و بہبود میں صرف ہوتا۔ یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہ ہوگا کہ امام خمینیؒ مرحوم قیاقی لکھ

تھے۔اور وہ بھی اس پر آشوب دور میں۔وہ یہ کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ایران ایک لا مذہب ملک ہو۔ جہاں شراب اور بئیر پانی سے زیادہ آسانی سے مہیا ہوں۔ تفریح کا بہترین ذریعہ قمار بازی ہو۔اور عیاشی زندگی کا لازمی جزو قرار پا چکی ہو۔در حقیقت وہ اس ماحول میں گھٹن محسوس کرتے تھے۔ان حالات میں بھلا ملک کس طرح فلاح و بہبود کے راستہ پر گامزن ہوتا۔ غریبی اور افلاس ہر جانب دن کی روشنی کے مانند پھیلا ہوا تھا۔ جبکہ شاہ کے کتے بھی ریشمی اور مخملی لباس زیب تن کرتے تھے۔

ان حالات کی وجہ سے امام مرحوم بہت زیادہ متفکر اور آزردہ تھے۔ دل کا سکون ناپید تھا اور رات کی نیند حرام تھی۔امام: نے جب ان حالات کے خلاف آواز بلند کی تو ان کے خلاف ظلم و ستم کا پہاڑ ڈھایا گیا اور انہیں مجبوراً وطن عزیز کو فریاسہ کر عراق میں مقیم ہونا پڑا۔وہاں حالات سازگار نہ تھے اس لئے کچھ عرصہ کے بعد فرانس جانا پڑا۔ان حالت میں بھی ہر ہر سانس میں ایرانی عوام اور ملت اسلامیہ کا دکھ درد سمویا ہوا۔ تھا۔ ان کی کاوشیں جاری تھیں کہ ایران کے خلاف سازگار ہو سکیں۔ ہمت مردان مدد خدا کے مصداق شاہ کی مطلق العنان حکومت کا خاتمہ اس مرد مومن کی کاوشوں کی بنا پر ہوا۔ ۱۹۷۹ء ایران میں شاہ کا تختہ پلٹ دیا گیا اور اسلامی حکومت عالم وجود میں آئی۔ مسلکی اختلافات تاریخ کا حصہ بن گئے۔

کیونکہ امام مرحوم کا پختہ عقیدہ تھا۔ واعتصموا بحبل الله جميعاً ولاتفرقوا۔ یعنی تم سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو اور آپس میں تفرقہ مت ڈالو۔

امام مرحوم انسانیت رواداری اور حق پرستی کا بے مثال جواباً ایرانی جنگی قیدی رہا کئے مگر وہ بہت کم تھے۔ اصلی فائدہ عراق کو ہوا تھا۔ اسکے برعکس ۱۹۹۰ء میں کویت پر عراقی حملہ کے بعد جب عراقی افواج وہاں سے حکماً پسپا ہو جائیں تو اپنے ہمراہ تقریباً ۶۲۵ مقصود اور معصوم افراد کو جبراً اغوا کر لے گئیں جن کا اب کوئی پتہ نشان بتانے سے عراق منکر تھے۔ ان لوگوں کے بچے رو رہے ہیں۔ بیویوں کی آنکھیں شوہروں کے انتظار میں پتھرا گئی ہیں اور مائیں اپنے بیٹوں کی واپسی سے مایوس ہو کر نیم پاگل ہیں۔ ان لوگوں میں دو ایک ہندوستانی۔ سعودی اور لبنانی تھی جس۔ ظاہر ہے کہ ان افراد کو اس طرح اغوا کرنا ایک بدترین مجرمانہ فعل تھا۔ لیکن چونکہ صدام حسین ظلم اور جبر کی مکروہ تصویر ہے اس لئے سب کچھ روا ہے۔

۱۹۷۹ء سے قبل لکھنؤ (یو۔پی) میں شیعہ ۔ سنی فساد ایک عام واقعہ بن چکے تھے۔ اور سنی

دونوں کلمہ گو ہیں اور ایک دوسرے کو قتل کرنا حرام ہے چاہے وجہ کچھ بھی ہو۔ مکانوں۔ دکانوں۔ کارخانوں وغیرہ کا توڑنا اور جلانا قطعاً ممنوع اور حرام ہے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ سب کچھ ہوتا تھا۔ امام خمینیؒ نے افتراق بین المسلمین کے خلاف سخت آواز اٹھائی اور یہ سلسلہ بالکل ختم ہو گیا اور عوام نے راحت کی سانس لی۔ عورتوں کا بیوہ ہونا بند ہوا۔ بچے اب یتیم نہیں ہوتے۔ نالیوں میں اب معصوم خون نہیں بہتا۔ یہ عظیم کام حضرت امام کے دست مبارک سے انجام پذیر ہوا جس کی جزا خیر پاک پروردگار عنایت کریگا۔

راقم مرحوم ایران کے سرکاری دورہ پر گئے تھے۔ سفر سے کچھ دن پہلے میری طبیعت خراب ہو گئی تھی اور میں ایران نہ جاسکا۔ دورہ ختم ہونے کے بعد ایک رفیق کار نے جو وہاں گئے ہوئے تھے مجھ سے کہا میاں۔ تمہاری بیماری بھی اللہ کی رحمت تھی۔ میں اس پہیلی کو سمجھ نہ سکا۔ میں نے ان سے وضاحت طلب کی تو انہوں نے کہا کہ کھانا تم قطعی نہ کھاتے۔ کیونکہ ہر کھانے میں ایک نہ ایک ڈش سور کے گوشت کی ضرور ہوتی۔ مثلاً پورک کٹلیٹ۔ بیکن رولس۔ وغیرہ وغیرہ اور تم ان چیزوں کی وجہ سے پورا کھانا ہی ترک کر دیتے۔ آخرش سوپ سلاد اور پھلوں پر کب تک گذارہ کرتے میرا دفاع قطعاً ماؤف ہو گیا جبکہ انہوں نے مجھے بتایا کہ صدر مرحوم کے اعزاز میں جو شاہی ضیافت ہوئی تھی اس کا کھانا پرس میں پک کر بذریعہ ہوائی جہاز طہران آیا تھا۔ استغفر اللہ۔ معاذ اللہ۔ اولاً تو پیرس میں ذبیحہ مشینوں کے ذریعہ ہوتا ہے جو حرام ہے اس لئے تتر بذات خود بھی کھانے کے لائق نہ تھے۔ اور پھر کربلا اور وہ بھی نیم چڑھا کے مصداق ان کے پیٹ میں سور کا قیمہ بھرا تھا۔ اس لئے انہیں کیا نے کا کوئی سوال قطعی نہیں اٹھتا تھا یہاں پر یہ بھی ذکر کر دینا عین مناسب ہوگا کہ پرس فیس قیام کے دوران امام خمینیؒ کے دستر خوان پر گوشت کے بجائے انڈوں اور مچھلی اہتمام ہوتا تھا کیونکہ ذبیحہ گوشت دستیاب نہ تھا۔ دوئم۔ ہر ملک ایسی ضیافتوں میں اپنے ملک کا کھانا پیش کرنا ہے۔ ایرانی کھانا انتہائی لذیذ اور مقوی ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں پرس سے کھانا منگانا ایک بے تکی بات تھی۔ مگر رضا شاہ چونکہ ذھنی طور پر مغرب کا غلام تھا اس لئے اس کا انداز فکر ہر وقت مغرب کی طرف گھومتا تھا۔ میں صدر مرحوم کے ساتھ مئی ۱۹۷۵ء میں انڈونیشیا گیا تھا جہاں ہمارے لئے مقامی کھانے کا انتظام تھا۔ جسے ہم سب نے شوق سے کھایا۔

امام مرحوم نے امت اسلامیہ کی ایک ایسی خدمت کی ہے جو کسی اسلامی ملک نے نہیں کی ہے۔ ۱۹۷۹ء کے اسلامی انقلاب کے بعد امام عالی مقام نے یہ طے کیا کہ ماہ رمضان المبارک کا آخری جمعہ تمام عالم اسلام میں ''یوم قدس'' کے شکل میں منایا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ قدم اس سے قبل کسی سربراہ یا کسی ملک نے نہیں اٹھایا تھا۔ اس کا خاطر خواہ اثر مرتب ہوا جس کا منشا اور مدعا تھا کہ تمام دنیا میں مسلمان، سیاسی معاشی اور تمدنی طور پر امریکی اسرائیل نوازی اور اسرائیل کی مسلم دشمنی کے خلاف متحد ہو کر قدم اٹھائیں۔ خود ایران میں عوام اس دن یکجا ہو کر قبلۂ اوّل کی بازیابی کے لئے غور فکر کرتے ہیں اور اسرائیل کو واضح الفاظ میں متنبہ کرتے ہیں کہ وہ پر امن طور پر القدس کو خالی کردے ورنہ امت اسلامیہ اپنا حق حاصل کرنا بخوبی جانتی ہے چاہے کتنی ہی قربانیاں پیش کرنی ہوں۔ امام مرحوم کی قیادت میں ایران نے ہمیشہ امریکہ کی سازشوں کو ریت کی محل کی طرح مسمار کر دیا۔ خدائی۔ مدد بھی شامل حال تھی کہ بہت سے سخت ترین مقابلہ بھی بہ آسانی انجام پذیر ہوتے۔ اور امریکہ کو منہ کی کھانی پڑی۔

اللہ ہم سب کو امام خمینیؒ کے دکھائے ہوئے راستہ پر صحیح طور پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ تاکہ ہم کامیابی کی ساری منزلیں۔ بہ آسانی طے کر سکیں اور ملت اسلامیہ کا نام روشن ہو۔ آمین۔

امام مرحومؒ کی پاک روح اس منتظر کو دیکھ کر انتہائی مسرور ہوگی۔ اس مضمون کو س دعا کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ اللہ جل شانہ امام مرحوم کی مقدس روح کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مراتب سے سرفراز فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

☆☆☆☆

کربلا: درس انسانیت

پروفیسر شاہ وسیم
شعبہ کامرس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

یہ وہ وقت ہے جب تعلیمات اسلامی کی ایک منصوبہ بند طریقہ سے کھلم کھلا خلاف ورزی کی جارہی تھی۔ حالات اس موڑ پر آچکے تھے جہاں سیدھے سادھے امن پسند لوگوں کے جان ومال کو خطرہ لاحق تھا۔ زندگی ہراساں اور پریشان نظر آرہی تھی۔ ظلم واستبداد کا ایک سیل رواں تھا جو امنڈ تا ہی چلا جارہا تھا۔ ظلم وجور کی آندھیاں چل رہی تھیں۔ تیرگی بڑھتی ہی چلی جاتی تھی۔ ظالم اور بد شعار من مانی کررہے تھے۔ بے گناہ اور بے قصور لوگ ظلم وستم کا نشانہ بن رہے تھے۔ عوام الناس اور کمزور اور بے سہارا لوگوں کا استحصال ہورہا تھا۔ لوگوں کو ان کے حقوق سے محروم کیا جارہا تھا۔ رقص وسرود کی محفلیں درباری ثقافت کا حصہ بن گئی تھیں۔ ہوا اور ہوس کا غلبہ تھا۔ معاشرہ کی بنیادیں ہل چکی تھیں۔ تمام تر کوشش اس بات پر صرف ہورہی تھیں کہ اپنے مفادات کی خاطر اسلام کو اس کے محور سے ہٹا کر پیش کیا جائے تاکہ ملوکیت پروان چڑھتی رہے۔

یہ وہ وقت تھا جب دمشق کے تخت پر یزید بیٹھا تھا۔ وہ یزید جس کے لئے اے۔ جے۔ آربری "صوفی ازم" پر لکھی اپنی کتاب میں تحریر فرماتے ہیں۔

"روحانی اقدار کو اکھاڑ پھینک دیا گیا (تھا) اور دنیوی خواہشات پر حکومت کی بنیاد رکھی گئی تھی" (۱)

یزید وہ تھا جس کو مسلمانوں بلکہ تمام شہریوں کی گردنوں پر مسلط کردیا گیا تھا۔ وہ بد مست' پکا شرابی تھا' تنبورہ بجاتا تھا اور کتوں سے کھیلتا تھا۔ علامہ راشد الخیری اپنی تصنیف "سیدہ کا لال" میں کہتے ہیں کہ

"تخت نشینی کے بعد وہ (یزید) اس کثرت سے شراب پینے لگا کہ کوئی لمحہ خالی نہ جاتا۔ اور جن عورتوں سے قرآن نے نکاح کی ممانعت کی ہے 'ان سے نکاح جائز سمجھتا"

ایسے میں عوام پر کیا اثرات مرتب ہوں گے' تاریخ الفخری کے مؤلف سے پوچھئے۔ وہ رقم

طراز ہیں کہ "یزید کے دور حکومت میں بازاروں میں ناچ گانے کا زور ہو گیا اور کھلم کھلا شراب پی جانے لگی۔ اس لئے کہ خود بادشاہ شراب کا متوالا تھا اور . . . دوشیزاؤں کے جھرمٹ میں رہتا تھا۔" عیش عشرت ایک مہنگا طرز عمل ہے۔ زندگی کو محور سے ہٹا دیتا ہے۔ انسان اپنا مقصد حیات کھو بیٹھتا ہے۔ عیش و عشرت کے لئے تمام تر وسائل کہاں سے مہیا ہوتے بجز اس کے کہ "اس (یزید) کے عمال حکومت عوام سے زبردستی خراج وصولتے تھے اور وہ محل میں پلے ہوئے سیکڑوں بندروں اور کتوں کو چاندی کے زیور اور ریشم کے کپڑے پہنواتا تھا" (جارج جرداق)

اسلام پر یہ کیسا وقت پڑا تھا؟ یہ کیا ہو گیا تھا؟

ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا ہے کہ معلم و رہبر انسانیت مرسل اعظم، خاتم المرسلین رحمۃ العالمین محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تبلیغ دین کر کے، الیوم اکملت لکم دینکم کی سند لے کر گئے ہیں۔ انسانیت کو سر بلند رہنے اور ایمان و عمل پر کاربند رہ کر کامیاب زندگی گذارنے کے راستے دکھلائے ہیں گئیں ہیں اور وہ بھی اس اعلان کے ساتھ کہ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ لیکن پھر کیا ہوا؟ اور یہ کیا ہو رہا ہے۔؟

زہد و تقویٰ کو کیا ہو گیا تھا؟ یہ گوشہ نشینی کیوں تھا؟

تاریخ اسلام، تعلیمات قرآن اور فرمان رسولؐ پر نظر کیجئے اور پھر فیصلے کیجئے کہ فرمانروائی کس کا حق تھا؟ کیا یہ اس کا حق نہ تھا جو قرآن کی زبان میں اولی الامر منکم کا مصداق تھا؟ صادق تھا، امام وقت تھا۔ جس کو میرے نبیؐ نے یہ کہکر پہچنوایا تھا: ھذا حسین فعارفوا۔"

زمانہ اس وقت خاموش تھا۔ صعوبتوں کا شکار تھکا ہارا۔ باد سموم کیا سے کیا کر رہی تھی؟۔ تاریخ اسلام مخلوں، پر خطر راہوں اور موڑوں اور سنگلاخ وادیوں سے گذاری جا رہی تھی۔ کاش! آخری نبیؐ کا ابدی پیغام ویسا ہی بروئے کار رہنے دیا جاتا جیسا وہ پہونچا گئے تھے۔ ایسے ہی میں عوام و خواص کی کیا ذمہ داری تھا؟ سورہ والعصر آواز دے رہا تھا۔

لیکن اے دین محمدؐ نہ گھبرا! ایسے میں ایک نواسہ رسول آگے آئے گا۔ دین کی استقامت کے لئے پیغام خدا اور رسولؐ کو جاری و ساری کرنے کے لئے یزید کو للکارنے کے لئے: اے باطل پرست

تو جھوٹا ہے۔ قرآن و وحی کی تکذیب کرنے والا ہے تو تو شجر اسلام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتا ہے۔ مسلمانوں کو، عام انسانوں کو دھوکہ نہ دے۔ اذان و نماز برپا بھی کرے تو روح اذان کہاں ہے؟ پیام نماز کہاں ہے؟ یہ وہ ہے جو کربلا میں روز عاشورہ ۶۱ھ انصاران باوفا' اعزاء واقربا اور اولادوں کے لاشہ صبر و شکر کے ساتھ اٹھائے گا' دین محمدیؐ استقامت کے لئے اور یہ اعلان بھی کرے گا۔

اے دین محمدؐ اگر تیری استقامت اسی میں ہے تو اے شام کی خون آشام تلوارو! اور میرے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔ ایسے میں فقط حسینؑ ہی نہیں بلکہ ان کے سبھی جانثار صبر کے اعلیٰ درجے پر فائز تھے۔ اور ساتھ ہی شکر بھی کر رہے تھے۔ بقول سید جعفر حسین منظر لکھنوی:

شہیدان وفا کے حوصلے تھے داد کے قبل
وہاں پر شکر کرتے تھے جہاں پر صبر مشکل تھا۔

(۲)

اپنی اس حکومت کو مستحکم کرنے کی غرض سے طاقت و حکومت میں بدمست یزید، حسینؑ سے طلبگار بیعت ہوا۔ اس حسینؑ سے جو وارث محمدؐ تھے، علیؑ اور فاطمہؑ کے بیٹے تھے، جن کے سینے میں اپنے باپ کا دل دھڑک رہا تھا۔ جن کے بھائی حسنؑ تھے۔ وہ بھلا ایک فاسق و فاجر کی بیعت کیسے کر سکتے تھے؟ وہ امام وقت تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے سوال ہے کہ "حسینؑ جن کی رگوں میں علیؑ' فاطمہ اور محمدؐ کا خون تھا' جو خدا سے ڈرنے والے تھے اور حق کے علمبردار تھے۔ وہ کس طرح سچ اور جھوٹ کو ایک پلڑے میں رکھ سکتے تھے"؟!

ولید بن عتبہ کے ذریعہ کی طرف سے سوال بیعت کے بعد حسینؑ نے مدینہ چھوڑا' مکہ کا رخ کیا' لیکن یہ سننے کے بعد کہ حاجیوں کے بھیس میں قاتل آچکے ہیں' حج کو عمرہ میں تبدیل کیا۔ وارث کعبہ کو اس کی حرمت کا خیال تھا۔ مکہ سے نکل کر حسینؑ اپنے قافلے کے ساتھ اپنی منزل (کوفہ) کی طرف روانہ ہوئے۔ گھیر کر کربلا لائے گئے۔ خیام فرات کنارے کی نصب ہوئے مگر ہٹا دئے گئے۔ ساتویں محرم ۶۱ھ سے پانی بند ہو گیا۔ خیام سے بچوں کی العطش العطش کی آوازیں آنے لگیں۔ وقت گذرا شب عاشورا نمودار ہوئی۔ حسینؑ اور ان کے ساتھیوں نے یہ شب عبادت میں بسر کی۔ اسی شب میں حسینؑ نے اپنی بیعت ہٹا کر سب کو ساتھ چھوڑنے کی اجازت دی اور اس طرح آزادی کا اور حریت

ضمیر انسانی کا دنیا کو سبق پڑھایا۔ اعزاء اقرباء اولادوں اور انصار انِ باوفا نے یہ کہہ کر ساتھ نہ چھوڑا کہ تف ایسی زندگی پر جو آپ کے بعد جی جائے۔

در حقیقت حسینؑ کا پیغام بالکل واضح تھا۔ بقول فیض احمد فیض:

طالب ہیں اگر ہم تو فقط حق کے طلبگار
باطل کے مقابل میں صداقت کے پرستار
انصاف کے نیکی کے مروت کے طرفدار
ظالم کے مخالف ہیں تو بیکس کے مددگار
جو ظلم پہ لعنت نہ کرے ' آپ لعین ہے
جو جبر کا منکر نہیں' وہ منکرِ دیں ہے

صبح عاشور نمودار ہوئی۔ قربانی کا دفتر کھل گیا۔ انصار ان باوفا اعزاء اور اقرباء و اولادوں نے سر کٹائے اور اللہ رسولؐ اور دین کی برتری کا اعلان کیا۔ حسینؑ شہید ہوئے۔ سر حسینؑ نے نوک نیزہ پہ سورہ کہف کی تلاوت کی۔ خیام میں آگ لگادی گئی۔ مصائب توڑے گئے۔ حق کا ذکر بابا فرید گنج شکر اس طرح کرتے ہیں:

اے نظام الدین! تم جانتے ہو کہ عاشورا کے دن (دس محرم) پیغمبرؐ خدا کے کنبہ پر کیسے کیسے مصائب ٹوٹے' ان کے لخت جگر گوشوں کو کس بے دردی سے قتل کردیا گیے۔ ظالموں نے انھیں پیاسا مارڈالا۔ حیف ان سنگ دلوں پر' حیف ان کافروں پر' حیف روز جزاء سے غافل رہنے والوں' حیف ان بد نصیبوں پر' ان ظالموں پر۔ ان کو معلوم تھا کہ یہ بچے زمین و آسمان کے بادشاہ کے بچے ہیں' یہ جانتے ہوئے بھی انھوں نے ان سب کو بے رحمی سے مارڈالا' ان کے گھر تاراج کرڈالے' انھیں برباد کرڈالا۔"[۲]

(۳)

مولانا ابوالکلام آزاد کہتے ہیں کہ "فی الحقیقت ..." سید الشہداء حضرت امام حسینؑ علیہ السلام اور ان کے جانثاروں کی قربانی "حق و صداقت' آزادی و حریت' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ایک عظیم الشان قربانی تھی۔ (جو) صرف اس لئے ہوئی تاکہ پیروان اسلام کے لئے ایک اسوۂ حسنہ پیش کرے اور اس طرح جہاد و حق و عدالت اور ثبات و استقامت کے ہمیشہ کے لئے ایک کامل ترین مثال قائم

رہے۔ پس جو بے خبر ہیں۔ان کو رونا چاہئے۔ان لم تبکو کوا فتباکو اور جو روتے ہیں ان کو صرف رونے پر ہی اکتفانہ کرنا چاہئے۔ان کے لئے سید الشہداء نے اپنی قربانی کا ایک اسوۂ حسنہ پیش کر دیا ہے اور کسی روح کے لئے ہرگز جائز نہیں کہ محبت حسینؑ کی مدعی ہو، جب تک اسوۂ حسنہ کی مطابقت کا اپنے اعمال کے اندر ثبوت نہ دے۔"[۳]

ممتاز حسین جونپوری کربلا والوں کو نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں: "حقیقتاً واقعہ کربلا ایک بہترین اخلاقی وسیاسی اور روحانی زندگی کا عملی پروگرام ہے۔اس کا تعلق ہندو، مسلمان عیسائی اور ہر انسان سے ہے۔ دنیا میں مختلف مذاہب اور قوم کی ہدایت کے لئے کتابیں نازل ہو چکی تھیں۔ نبی۔۔۔ دنیا میں آچکے تھے اور زندگی کا دستور العمل بتایا جا چکا تھا۔ مگر پھر بھی عمل کا مؤثر طریقہ اختیار کرنے والے اور اس کے تعلیم کا دلنشیں عنوان معلوم کرنے کے لئے دنیا کی روح کو بڑی الجھن اور اس میں بڑی گتھی یزید کی عیارانہ اور انسانیت سوز زندگی نے پیدا کر رکھی تھی۔ اس لئے خدا کے سچے عاشق اور بنی نوع انسان کے بہترین دل سوز اور ہمدرد امام حسین اپنے کنبے اور چنے ہوئے عزیزوں اور دوستوں کو جن پر پورا پورا بھروسہ تھا، لے کر کربلا کے میدان میں آگئے۔ حق و باطل۔ کفر و اسلام' سرمایہ پرستی اور مزدوری' حریت اور جبر و ظلم وغیرہ کی ہمیشہ کے لئے ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ جس کی کامیابی کا راز جان و مال کی قربانی میں مضمر ہے۔اس طرح حسینؑ نے اپنے عمل سے حق و صداقت کو ایک دوامی زندگی بخشی اور ایسا نیا اور پُراثر طریقہ نکالا کہ انسانی عقل و خیال اور طاقت جن کی تمام دنیا پر حکومت ہے۔اس سے بہتر طریق عمل ایجاد کرنے اور سمجھنے سے قاصر ہے۔"[۴]

کربلا میں ظلم واستبداد اپنی حدوں سے بھی تجاوز کر گیا تھا، لیکن صبر حسینؑ اس سے بالاتر تھا۔ یزید مورچہ تو جیت گیا لیکن جنگ ہار گیا۔اموی سیاست پر کربلا نے ایک ضرب کاری لگائی اور ماضی' حال اور مستقبل کا احاطہ کئے ہوئے' اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بے نقاب اور رسوا کر دیا۔اس سلسلے میں علامہ اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں خراج عقیدت پر مبنی درج ذیل اشعار پیش کئے ہیں۔

تاقیامت قطع استبداد کرد　　　موج خونِ او چمن ایجاد کرد
بہر حق در خاک وخوں غلطیدہ است　　　پس بنائے لاالہ گردیدہ است

خوں او تفسیر ایں اسرار کرد ملت خوابیدہ را بیدار کرد
نقش الا اللہ بر صحرا نوشت سطر عنوان نجات ما نوشت

فریڈرک جے۔ کولڈ امام حسینؑ اور حضرت عباسؑ کو نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتا ہے:

"اگر میں نوجوان ایشیا، افریقہ، آسٹریلیا، مشرق وسطی امریکہ اور یورپ کو عراق کے میدان میں جمع کرسکوں اور اگر حسینؑ اور عباسؑ کے روضوں کے روبرو کھڑا ہوسکوں اور اگر میری زباں اور لب ولہجہ سب لوگ سمجھ سکیں تو میں حسینؑ کی زندگی اور موت کے اندرونی پیغام کے متعلق گفتگو کروں گا۔ حسینؑ انسانیت کاملہ کا بہترین نمونہ تھے۔ جب کہ وہ ریگستان میں 'دریاؤں میں 'نفرت اور بے رحمی کی تاریک کھائیوں میں انس وہمدردی کی دعوت دے رہے تھے۔ ان کی عملی زندگی میرے نزدیک ایسی ضرب المثل ہے جو عالمگیر معنی رکھتی ہے"

امام حسین علیہ اسلام کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے مہاتما گاندھی نے کہا ہے کہ "حسینؑ اور ان کے گنے چنے ساتھیوں نے ظلم اور بے انصافی کے سامنے سر نہیں جھکایا اس وقت وہ جانتے تھے کہ انھیں موت ہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اگر وہ سر جھکادیتے تو انسانیت رسوا ہو جاتی، ان کا مذہب اور عقیدہ مٹ جاتا۔ اس لئے انھوں نے موت کا استقبال کیا۔ حسینؑ نے اپنی نگاہوں کے سامنے اپنے بیٹے اور بھتیجے کو ذبح ہوتے دیکھا۔ ان کے ساتھیوں نے تشنگی کو ترجیح دی لیکن جس نظام کو وہ بے انصافی اور ظلم قرار دیتے تھے] اس کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ میرا یقین ہے کہ اسلام تلوار سے نہیں اپنے درویشوں کی قربانیوں سے پھیلا ہے۔"

اور بقول رادھا کرشنن (صدر جمہوریہ ہند) "امام حسینؑ نے اپنی قربانیوں اور ایثار سے دنیا پر ثابت کردیا کہ دنیا میں حق وانصاف کو زندہ اور پائندہ رکھنے کے لئے ہتھیاروں اور فوجوں کے بجائے جانوں کی قربانی پیش کر کے کامیابی حاصل ہوسکتی ہے۔ امام حسینؑ نے ہمیں بتادیا کہ حق وصداقت کے لئے اپنا سب کچھ قربان کیا جاسکتا ہے۔"

کربلا کا پیغام حق ہے۔ یہ ایک دائمی پیغام ہے ان پیروان حق کے لئے جنھیں ظلم واستبداد سے نفرت ہے 'عدل وانصاف جن کا شیوہ ہے۔ زمان ومکان کے فاصلے حائل ہیں لیکن کربلا آج بھی ہر

مظلوم کے درد کا درماں ہے۔" واقعات کربلا سے عملی سبق ملتا ہے کہ کیسے آپس میں ملنا چاہئے اقلیت اکثریت کو کیسے دبا سکتی ہے۔ 'عزیزوں کے کیا حقوق ہیں؟ دوست کی کیا صفت ہے؟ ظلم کیا ہے؟ اور انصاف کسے کہتے ہیں؟ صبر و وفا' حلم' خلق' حفظ مراتب' ایثار' خداشناسی' اطاعت وغیرہ کا ایک خاکہ کھینچتے ہوئے اسی سرچشمہ ابدی اور عشق کے سمندر میں حسینؑ جاکر مل گئے۔۵

سچ ہے کہ " قربانی و شہادت کا یہ واقعہ اسلامی دنیا میں ایک انقلاب لایا۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا موجب بنا' اسلامی عقاید' اخلاق و وفاداری' صبر تحمل' خیال و فکر کی آزادی اور خدا میں اعتقاد و ایقان کو اس واقعہ نے نئی زندگی اور نئی توانائی دی۔"۶

واقعہ کربلا سیاسی' سماجی' ثقافتی اور معاشی اثرات کا احاطہ کئے ہوئے ادب پر بھی بطور استعارہ اثر انداز ہوا ہے۔ ممتاز حسین جونپوری نے ۱۹۱۶ میں ایک بڑا کارنامہ انجام دیا جب انھوں نے مشرقی زندگی اور مشرقی ادب پر واقعہ کربلا کے اثرات کو شیعہ کالج کے اخبار سرفراز کے محرم نمبر میں اپنے مضمون (اور بعد میں اپنی کتاب "خون شہیدان") میں واضح کیا تھا۔"

مسلم ہو یا غیر مسلم سبھی لوگ جن کو عدل و انصاف سے محبت ہے، جو حق و انسانیت کی بات کرتے ہیں۔ 'بارگاہ حسینی میں نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ بقول مہدی نظمی مرحوم۔

درِ حسینؑ پہ ملتے ہیں ہر خیال کے لوگ
یہ اتحاد کا مرکز ہے آدمی کے لئے

حوالے:

۱۔ صوفی ازم، آر، جے، بری صفحہ ۳۲

۲۔ مجموعہ ملفوظات، راحت القلوب' صفحہ ۲۲۲

۳۔ تاریخ جنگ کربلا۔ سیدنا امام حسین علیہ السلام: اسوۂ حسنیٰ تاج پبلیشرز، دہلی ۱۹۲۷' صفحہ ۶۴

۴۔ خون شہیداں' نظامی پریس' لکھنو ۱۹۴۲' صفحات ۱۸۔۱۹

۵۔ ایضاً

۶۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔

☆☆☆

"والی مصر کی بیوی زلیخا"

ڈاکٹر نرگس جہاں، شعبہ فارسی۔
دہلی یونی ورسٹی۔ دہلی

فارسی اور اردو زبان وادبیات کی تاریخ میں کچھ ایسی خواتین کا نام ثبت ہے جن کی موجودگی کہ وجہ سے ان زبانوں کے ادب کو غیر معمولی جاذبیت ورنگینی حاصل ہو گئی ہے۔ جیسے مجنوں کے ساتھ لیلیٰ، فرہاد کے ساتھ شیرین اور حضرت یوسف علیہ اسلام کے ساتھ زلیخا کا نام جڑا ہوا ہے۔ ان میں حضرت زلیخا کو جو شہرت ملی وہ کسی اور کے نصیب میں نہیں آئی۔ نہ صرف ادب بلکہ اسلامی دنیا میں بھی زلیخا لوگوں کی توجہ کا مرکز رہی ہیں۔ اہل اسلام اکثر اپنی بچیوں کا نام زلیخا رکھتے ہیں اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ اب یہ نام اسلامی تہذیب وتمدن کا حصہ بن چکا ہے۔

ڈاکٹر علی اکبر دھخدا اپنی معرکتہ الارا کتاب لغت نامہ دھخدا میں لفظ زلیخا کے ذیل میں رقم طراز ہیں کہ عزیز مصر کی بیوی کا نام زلیخا تھا۔ واضح رہے کہ سریانی زبان میں راعیل کا معرب زلیخا ہے۔ زلیخا کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں کہ ان کا بدن بے انتہا صاف اور چمکیلا تھا اتنا کہ نظر پھسل جائے۔ بعض محققین کی رائے ہے کہ زلیخا کا ملک مغرب ہے اور ان کا اصلی نام سریانی میں راعیل تھا اور زلیخا اس کا معرب ہے اور زلیخا ہی زیادہ مشہور ہوا۔ عام طور پر لوگ اس نام کا تلفظ کرتے وقت شروع میں فتح اور لام کے نیچے کسرہ کا استعمال کرتے ہیں (زَلِیخا) جو کہ بالکل غلط ہے کیونکہ علم تعریف میں اس کا وزن کہیں نہیں ہے۔ کچھ حضرات کہتے ہیں کہ نہیں یہ زَلِیخا ہے یعنی فتح اول وکسرہ لام یہ درست ہے اور اس کے معنی کھجور کے ہوتے ہیں اور یہ عجمی نام ہے فرہنگ آنند راج، فرہنگ برہان نے زلیخا کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ عزیز مصر کی بیوی کا نام زلیخا تھا جو یوسف علیہ اسلام کے حسن پر فدا ہو گئی تھیں۔ لیکن ڈاکٹر محمد معین نے فرہنگ فارسی میں اس طرح تشریح کی ہے کہ بوتیغار، بوطیفار، فطفید (فُ طِ) کی بیوی اور یوسف ابن یعقوب کی معشوقہ تھیں اور یہ لفظ "آزنت" کا مقلوب ہے۔ عرب اسے ابتداء میں الف ولام کے ساتھ تزینی کے معنی کرتے تھے "الزنت" تلفظ کرتے تھے اور بعد میں بغیر الف کے

''زلیخا'' کہنے لگے یا پھر ''الزیخا'' اور پھر بعد میں آہستہ آہستہ یہ لفظ 'زلیخا' ہوا اور ''زیخا'' سے 'زلیخا' دھخدا نے اس لفظ کی وضاحت زلیخا یعنی فتح اول وکسرہ لام سے کی ہے اور تشریح میں عزیز کی بیوی جس نے بعد میں حضرت یوسف سے شادی کرلی تھی۔ا'' (لغت نامہ دھخدا۔ ص ۴۲۴)۔

حضرت زلیخا کو لیلیٰ، شرین یا پھر کسی عشقیہ داستان کی خاتون پر فوقیت وبرتری دووجہ سے حاصل ہے کہ ایک تو آپ پہلے حضرت یوسف علیہ السلام کی عاشقہ اور بعد میں ان کی منکوحہ بیوی بنیں دوسرے آپ کا ذکر قرآن کریم میں حضرت یوسفؑ کے قصہ کے ضمن میں آیا ہے اس تمام واقعہ کو بیان کرتے وقت کہیں بھی قرآن نے زلیخا کا نام نہیں لیا بلکہ لفظ ''امراۃ (عورت) کیا ہے یعنی والی مصر کی بیوی اگر یوں کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ مفسرین قرآن نے امراۃ کی تفسیر زلیخا کے نام سے کی ہے۔

گویا زلیخا کا اصل نام راعیل تھا اور ان کا زمانہ حضرت یوسف علیہ السلام کا زمانہ ہے اس وقت مصر کی سلطنت کا مالک اریان بن ولید تھا۔ اس کا وزیر خزانہ قطفے بن رحیب تھا اور یہی راعیل یعنی زلیخا کا شوہر تھا اور جب اہل قافلہ حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں سے نکال کر مصر کے بازار میں بیچنے کی غرض سے لے گئے تو اسی والی مصر نے یوسف کو خرید لیا اور اپنے گھر لے گیا اور اپنی بیوی سے کہا کہ اسے بہت عزت واحترام کے ساتھ رکھنا بہت ممکن ہے کہ یہ ہمیں فائدہ پہنچائے یا پھر ہم اسے اپنا بیٹا بنالیں گے۔ لیکن حضرت یوسفؑ جیسے جیسے بڑے ہوتے گئے اور عمر کو پہنچے تو خداوند کریم نے انہیں جہاں ایک طرف علم ودانش سے نوازا تو دوسری طرف انہیں حسن بھی عطا کیا۔ کہتے ہیں کہ حضرت یوسف کو جو حسن عطا کیا گیا تھا وہ نصف دنیا کے برابر تھا اور بقیہ پوری دنیا کو عطا کیا گیا۔ اسی کے ساتھ ہی ساتھ حضرت یوسف کو شرافت اور شرم وحیا کے زیور سے سجایا گیا تھا۔ قصہ مختصر حضرت یوسف کے حسن پر والی مصر کی بیوی زلیخا (راعیل) کچھ اس طرح عاشق ہوئیں کہ اپنی عزت وناموس اور پاکدامنی پر داغ لگا بیٹھیں۔ حافظ نے کیا خوب اشارہ کیا ہے۔

من از ان حسن روز افزون کہ یوسف داشت دانستم
کہ عشق از پردہ ٔ عصمت برون آرد زلیخا را

(حافظ)

زلیخا کے عشق نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ ایک دن جب وہ اپنے نفس کے ہاتھوں مجبور ہو گئیں تو کمرہ کا دروازہ بند کر کے حضرت یوسف کو اپنے حسن کے نظارہ کی دعوت دی۔ یوسفؑ اپنی پاکدامنی کو بچانے کے لئے وہاں سے بھاگے اور پیچھے پیچھے حضرت زلیخا۔ اسی پکڑ دھکڑ اور بھاگ دوڑ میں حضرت یوسف کا پچھلا دامن حضرت زلیخا کے ہاتھ آ گیا اور عزت کا دامن تار تار ہو گیا لیکن یہی پھٹا ہوا دامن بعد میں ان کی پاکدامنی کا ثبوت بن گیا۔ قصہ یوں ہوا کہ جب یوسف اپنی پاکدامنی کو بچانے کے لئے دروازہ کیجانب لپکے تو دروازہ پر حضرت زلیخا کے شوہر نے دیکھ لیا۔ اب زلیخا نے الٹا الزام یوسفؑ پر لگادیا۔ اور اپنے شوہر کو بھڑکانے لگی کہ اس شخص نے تیری بیوی کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے لہٰذا اس کو دردناک سزا دی جائے۔ اور اس کی سزا یہ ہے کہ اسے قید و بند کی مشقت میں گرفتار کر دیا جائے۔ لیکن زلیخا کے قبیلہ کے ایک شخص نے ہی حضرت یوسف کی پاکدامنی کی گواہی دی اور کہا کہ اگر اس شخص کا دامن آگے سے پھٹا ہوا ہے تو یہ مجرم ہے اور اگر پچھلا دامن پھٹا ہوا ہے تو عورت (زلیخا) مجرم ہے۔ پکڑ دھکڑ میں تو دامن پیچھے سے پھٹا تھا اور وہی ان کی شرافت کا بیّن ثبوت تھا۔ اس کھینچا تانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت یوسف کے حصہ میں قید آئی اور حضرت زلیخا کے حصہ میں زمانہ بھر کی رسوائی۔

خود کو عورتوں اور لوگوں کی ملامت سے بچانے کے لئے حضرت زلیخا نے عورتوں کی ایک مجلس ترتیب دی ان کے ہاتھوں میں لیموں (بعض روایات میں ترنج) ملتا ہے دیئے اور ہاتھوں میں چھری لیموں / ترنج دیکر کہا کہ جب حضرت یوسف یہاں سے گزریں تو یہ لیموں کاٹ دینا۔ چنانچہ جب حضرت یوسف وہاں سے گذرے تو عورتیں ان کے حسن میں اس طرح محو ہوئیں کہ لیموں کاٹنے کے ساتھ ساتھ اپنے ہاتھ بھی کاٹ لئے۔ اب حضرت زلیخا کو اپنا داغ چھڑانے کا موقع مل گیا انھوں نے عورتوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہ وہی شخص ہے جس کے لئے تم مجھے لعن طعن کرتی ہو۔ (بعد کا تمام واقعہ صرف حضرت یوسف علیہ السلام سے مربوط ہے اسے یہاں طوالت کے خوف سے صرف نظر کرتے ہیں) (یہ واقعہ قرآن کریم میں سورہ یوسف میں آیات ۲۰ سے تا ۲۵ بیان ہوا ہے)

قارئین کرام! ہم اس قصہ سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ شرم و حیا انسانی حسن کو دوبالا کرتے ہی ہیں لیکن یہ انسانی شرافت اور اس کی پاکدامنی کی ضمانت بھی ہیں حضرت یوسفؑ کی عزت ان کی شرم

وحیا کی بدولت محفوظ رہی اور حضرت زلیخا اپنی بے حیائی نفس اور نفسانی خواہشات کی غلامی میں ماری گئیں اور نتیجہ میں دنیا بھر کی رسوائی ان کے نام لکھی گئی۔ اس کہانی میں آج کے عوام بالعموم عورت ومرد اور بالخصوص عورتوں کے لئے یہ پیغام ہے کہ وہ شرم وحیااور پاکدامنی کے لباس کو اپنائیں۔ بے شرمی اور بے حیائی کے لباس کو ترک کردیں۔ ورنہ آخر میں ان کے حصہ میں صرف اور صرف رسوائی اور بدنامی ہے۔ اور شرم وحیا میں حضرت یوسف کی طرح عزت نفس اور شرافت ہے گوکہ حضرت یوسف مرد تھے لیکن اپنی شرم وحیا کی بدولت ہی اپنی عزت پر حرف نہ آنے دیا۔ عورتوں کی ترقی اور ایک صاف ستھرے سماج کی تشکیل ان کی شرم وحیااور پاکدامنی میں مضمر ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب جب عورت نے اسے مقام کو کھویا تب تب سماج میں گڑبڑی اور گمراہی آئی۔ ایک عورت خاندان کے چار لوگوں کی دوزخ اور جنت کی ضامن ہوتی ہے۔ حدیث قدسی ہے کہ ایک عورت اپنے ساتھ چار لوگوں کو جنت میں لے جائے گی یا دوزخ میں۔ باپ بھائی، بیٹا اور شوہر۔

شوہر نے ادب میں بالخصوص فارسی ادب میں کلاسیکی شعراء نے یوسف وزلیخا کی عشقیہ داستان کو لیکر بے شمار ادبی عشقیہ اور فلسفیانہ نکات بیان کیے ہیں اور اپنی شاعری میں عشقیہ داستان سے عشقیہ رنگ بھر دیا ہے ان کے یہاں حسن مظہر عشق ہے تو عشق مظہر رسوائی۔ اور عشق ومشک چھپائے نہیں چھپتے۔ جہاں حافظ کو یہ یقین کامل تھا کہ یوسفؑ کا حسن زلیخا کے لئے بدنامی کا باعث ہوگا تو وہیں پر شیخ سعدی کا یہ عقیدہ کہ حسن وعشق کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔

ہر کجا سروقدی چہرہ چو یوسف بنمود
عاشق سوختہ خرمن چو زلیخا برخاست

(سعدی)

صایب اگرچہ ایک طرف عشق میں بدنامی کے قائل ہیں تو دوسری جانب اس فکر سے آسودہ حال ہیں کہ اگر یوں لوگوں کو معلوم ہوگیا تو کیا ہوگا۔ اور آسودہ خیالی ہی بے چارے عاشق کے لئے لوگوں کی ملامت اور لعن طعن کے سامنے ڈھال کا کام کرتی ہے۔

ہر کہ پیرا ھن بہ بدنامی درید آسودہ ستد
برزلیخا طعن ارباب ملامت عارنیست

(صایب)

دوسری جانب صایب کے یہاں حسن کی قدردانی اس کے چاہنے والوں سے ہے

مصر انصاف از زلیخا طلعتان خالی شدہ
ورنہ چندین ماہ کنعانی بہ بازارمنست

(صایب)

ناصر خسرو اس عشقیہ داستان سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اگر انسان صبر کا دامن پکڑے رہے تو اس کو اس کا پھل ضرور ملتا ہے جو بہت میٹھا ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت یوسف کو اس کا پھل ان کی پیغمبری میں ملا۔ اور حضرت زلیخا کو ان کی بیچینی کی وجہ سے بدنامی اور یہ کڑوا پھل انہیں ان کی جلد بازی کی وجہ سے ان کے ہاتھ آیا۔

یوسف بہ صبر خویش پیمبر شد
رسواشتاب کرد زلیخا را

(ناصر خسرو)

شعر وادب کی دنیا میں حضرت یوسفؑ کا پیراہن، کنویں سے قافلہ کا انہیں نکالنا، مصر کے بازار میں فروخت کرنا، زلیخا کا ان پر عاشق ہونا، عورتوں کا لیموں (ترنج) اور ہاتھوں کا کاٹنا، یوسفؑ کا قید ہونا وغیرہ وغیرہ ایسی تلمیحات ہیں جس سے شعرا حضرات نے خوب استفادہ کیا ہے۔ یہاں نمونہ کے طور پر کچھ شعراء کے اشعار نقل کرتے ہیں۔

ھست آسیہ بہ زھدو زلیخا بہ ملک از آنک
تسلیم مصر وقاہرہ برقہرمان اوست

(خاقانی)

از چاہ دی رستہ بہ فن این یوسف زرین رسن
وزابر مصری پیرھن اشک زلیخا ریختہ

(خاقانی)

بر آمد یوسفی نارنج دردست
ترنج مہ زلیخا وار بشکست

(نظامی)

زلیخا چوگشت از می عشق مست
بہ دامان یوسف در آویخت دست

(بوستان)

دامن پیرھن یوسف گل را بدرید
بازگوی کہ براد عشق زلیخا آورد

(سلمان بنقل شرفنامۂ منیری)

زلیخا کا عشق یک طرف تھا اور اس میں نفسانی خواہش کا عنصر بھی شامل تھا اس عشق میں دنیاوی لذت تو ہوتی ہی ہیں لیکن ہمت کم اور وقتی۔ لوگ اس طرح کے عشق سے مزے لیتے ہیں فارسی شعرا نے بھی زلیخا کے اس عشق سے فایدہ اٹھاتے ہوئے فارسی ادب کو اخلاق کے زیور سے آراستہ کیا ہے۔

فارسی زبان کا قدیم و جدید ادب زلیخا اور یوسف علیہ السلام کی تلمیحات سے بھرا ہوا ہے۔ یہاں اس مختصر سے مقالہ میں سب کا احاطہ کرنا تو ممکن نہیں البتہ چند مثالوں پر اکتفا کرتے ہوئے۔ اس مقالہ کو یہیں پر ختم کرتی ہوں۔

ہر کہ از دست زلیخا بی ھوس عالم جست
بہ دو عالم ندھد گوشۂ زندانی را

(صایب)

آنچہ اودارد زخوبی گرزلیخا داشتی
باھمہ عصمت از دیوسف نمی کردی فرار

(قاآنی)

شدیم از گریہ نابینا، چویعقوب از غم یوسف
زلیخا وارگشتہ پیرو این خود بود حق ما

(قطران)

زلیخا اور حضرت یوسف کی عشقیہ داستان دلچسپ اور پر کشش تو ہے لیکن یہ کوئی طبع زاد داستان نہیں ہے جسے سر سری نظر سے پڑھا جائے یا سنا جائے بلکہ یہ ایک ایسی داستان ہے جس کی جانب قرآن اشارہ کرتا ہے اور اس کہانی کا دوسرا اہم کردار جن کے گرد پوری کہانی گھومتی ہے کوئی معمولی شخصیت نہیں بلکہ ایک پیغمبر ہیں جو گوناگوں آزمایشی دور سے گذرے اور زلیخا کو انہیں دعوت حسن دینا پھر ان پر الزام عاید کرتے ہوئے، قید وبند کی تکالیف دینا بھی حضرت یوسفؑ کی آزمایش تھی۔ حضرت یوسفؑ کا ان تمام آزمایشوں سے کامیابی کے ساتھ نکل آنا ان کی بلند ہمتی، ثابت قدمی اور قوت ارادہ کی دلیل ہیں او اس دلیل کا راز ان کی پیغمبری میں پوشیدہ ہے۔ داستان کا یہی حصہ فی الزمانہ اور آیندہ انسانی نسلوں کو لئے ایک عبرت انگیز سبق ہے۔

☆☆☆☆

مسلمان، دہشت گردی اور امریکہ

از: رضاء الرحمٰن عاکف، سنبھلی

یہ تاریخ کی ایک تلخ سچائی ہے کہ مسلمانوں کو دنیا کی ہر قوم نے ہی ظلم و تشدد کا نشانا بنایا ہے۔ اور یورپ و امریکہ تو اس طرح کی سرگرمیوں میں پیش پیش رہے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف اسلام کو بدنام کرنے کی سازشیں ہی کیں بلکہ مسلمانوں کو نقصان پہونچانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ انھوں نے مسلمانوں کو نقصان پہونچانے کے لئے دیرینہ اختلافات کو بھلا کر متحدہ محاذ بنانے کے بعد مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ اسلام سے پہلے یہود و نصاریٰ باہم ایک دوسرے کے سخت ترین دشمن رہے ہیں مگر ظہور اسلام کے بعد ہی یہ دونوں ازلی دشمن اسلام کی رقابت میں باہم شیر و شکر ہو گئے۔ اور اپنے دیرینہ اختلافات بھلا کر مسلمانوں کو زیر کرنے کے ارادے سے ایک دوسرے کے معاون بن گئے۔ جبکہ اصولی طور پر نصاریٰ کو یہودیوں کا سخت مخالف ہونا چاہئے تھا۔ کیونکہ عیسائی مذہب کی روایات کے مطابق ان ظالموں نے نہ صرف ان کے پیغمبر عیسیٰ علیہ اسلام کو تکلیفیں پہونچائیں بلکہ یہ ظالم ان کی جان کے درپے ہو گئے تھے۔ مگر بُرا ہوا ن لوگوں کی اندھی دشمنی کا کہ مسلمانوں سے خود ساختہ دشمنی کے نام پر اپنے ازلی دشمن سے دوستی کا ہاتھ ملا بیٹھے۔

تاریخی اعتبار سے جب ہم دنیا پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں دنیا کی ہر ایک تحریک ہی اسلام و مسلمانوں کے خلاف کام کرتی نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں خواہ یورپ کی صلیبی تحریک ہو یا روس کی کمیونسٹ تنظیم —— ہندوستان کی شدت پسند ہندو جماعتیں ہوں یا یورپ کی مادّی تحریکیں —— بنیادی اعتبار سے سبھی کے مقاصد یکساں نظر آتے ہیں۔ جس کے تحت انھوں نے اپنا مشن یہ بنالیا ہے کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو سیاسی و اقتصادی طور پر کمزور کر دیا جائے۔ روس کی کمیونسٹ تحریک

بظاہر زار شاہی اور یورپی سامراج کے خلاف عمل میں آئی تھی مگر اشتراکی انقلاب کی کامیابی کے بعد ان ممالک میں اسلام و مسلمانوں کے خلاف جو رویہ اپنایا گیا اور وہاں جس طرح مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی وہ تاریخ کا ایک نا قابل فراموش المیہ ہے ——اسی طرح یورپ نے مسلمانوں کو نقصان پہونچانے کے لئے گھناؤنی سازشیں کیں اور اپنے ناپاک عزائم کے تحت ایک دوسرے کا حریف بنا کر انھیں باہم دست و گریباں کر دیا —— کون نہیں جانتا کہ ماضی قریب میں ہی کس طرح ایران کے اندر اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد وہاں عدم استحکام پھیلانے کے ارادے سے عراق کے ذریعہ اس پر حملہ کرادیا گیا۔ پھر جب عراق علاقے کی طاقت بن کر ابھرنے لگا تو اسے کمزور کرنے کے لئے پہلے صدام سے کویت پر حملہ کرایا گیا اور پھر اس کے اس عمل کو بہانہ بنا کر امریکہ ہی عراق پر دھاوا بول دیا۔ اس طرح امریکہ نے پہلے تو افغانستان کے اندر طالبان کو مضبوط کر کے ان کو اقتدار تک پہونچایا۔ مگر جب امریکی مفاد کو طالبان سے خطرہ محسوس ہوا تو انھوں نے طالبان کو ہی سبق سکھانے کی ٹھان لی اور پھر ۱۱ر ستمبر کو امریکہ میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور پنٹاگن پر ہوئے حملوں کو بہانہ بنا کر بلا تحقیق افغانستان پر حملہ کر دیا۔ یہ سب مسلمانوں کے خلاف امریکہ کی جارحیت نہیں تو اور کیا ہے۔؟

ماضی میں اسلام دشمن طاقتوں نے جس طرح مسلمانوں کو ظلم و استبداد کا نشانا بنایا ہے وہ تو ایک تلخ داستان ہے ہی لیکن آج امریکہ جس طرح معصوم و بے گناہ مسلمانوں کے خون سے اپنے دامن کو داغدار کر رہا ہے یہ عالم انسانیت کے منہ پر بدنما داغ ہے۔ اور افسوس تو یہ ہے کہ اس سلسلے میں خود مسلمان اس کو بھر پور تعاون دے رہے ہیں۔ اور اپنے بھائیوں کو ان کی بے گناہی کی سزا دلانے کے لئے ظالم امریکہ کے شانے سے شانہ ملائے کھڑے ہیں۔ ایران ہو یا عراق صومالیہ ہو یا لیبیا۔ افغانستان ہو یا فلسطین۔ غرض کہ مسلم دنیا کا کون سا ایسا خطہ ہے جہاں امریکی جارحیت نظر نہ آئے۔ اور جہاں کی زمین مسلمانوں کے خون سے آلودہ نہ ہوئی ہو۔ ان تمام مظالم کے بعد بھی مسلمانوں کی آنکھیں نہیں کھلتیں اور آج بھی یہ مسلمانوں کے قاتل امریکہ کو اپنا دوست کہتے ہیں —— یہاں میں ان لوگوں سے سوال کرنا چاہوں گا کہ اگر وقت کا یہ فرعون واقعی تمہارا دوست ہے تو اس نے کبھی تمہاری ہمدردی یا مفاد میں بھی قدم اٹھایا ہے یا نہیں ؟ —— کیا ان ظالموں نے صہیونیت اور اسرائیل کے مظالم سے تمہارے

معصوم فلسطینی بھائیوں کو نجات دلانے کی کوئی مؤثر کارروائی کی ہے؟——یا تمہارے ذریعہ صرف تمہارے ہی بھائیوں ہی کا خون بہایا گیا ہے؟——مگر افسوس! آج مسلمان اپنی آنکھیں نہیں کھولتا اور وہ یہ دیکھنے کی صعوبت برداشت کرنے کو تیار نہیں کہ فلسطین کے اندر آج ہر روز بھی کتنے بے گناہ مسلمان ظالم یہودیوں کے ہاتھ سے جام شہادت نوش کر رہے ہیں ——کتنے معصوم فلسطینی مسلمانوں کے مکانوں کو مسمار کیا جارہا ہے ——یہاں یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ امریکہ دن ورات انسداد دہشت گردی کا راگ الاپتا رہتا ہے اور دنیا سے دہشت گردی کے خاتمے کا دعویٰ کرتے کرتے جس کی زبان نہیں تھکتی۔ کیا اس نے اپنے پروردہ اسرائیل (جو اس عہد کا سب سے بڑا دہشت گرد ہے) کے خلاف بھی کبھی کوئی عملی قدم اٹھایا ہے؟ ——نہیں ایسا نہیں ——یہ ایسا کیوں کرے گا——کیوں کہ وہاں تباہ و برباد ہونے والے مسلمان جو ہیں——وہاں عیسائی یا یہودی نہیں مسلمان مارے جارہے ہیں ——انھیں کی املاک لُٹ رہی ہے——انھیں کے مکان مسمار ہو رہے ہیں۔ انہیں کی عزت پامال کی جارہی ہے——یہ مسلمانوں کی مدد کیوں کریں ——بلکہ ان ظالموں کی تو دلی خواہش ہی یہی ہے کہ دنیا کا مسلمان تباہ و برباد ہوتا رہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ اسرائیل کچھ بھی کرے اس کو کھلی آزادی ہے——نہ اس سے کوئی باز پرس کرتا ہے اور نہ ہی اسکے خلاف کوئی تادیبی کارروائی ہوتی ہے——اور مسلمان جو اپنے حق آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں ——انہیں دہشت گرد کہا جاتا ہے ——انھیں مختلف قسم کی دھمکیاں دی جاتی ہیں ——ان کے ہمدرد ممالک کو ہراساں کیا جاتا ہے اور ان کے خلاف سخت تنبیہ کی جاتی ہے——یہ اپنے وقت کا کتنا بڑا ظلم ہے کہ جن کی سرزمین غصب کی گئی۔ اس کی آزادی کے لئے لڑنے والے دہشت گرد، امن دشمن اور سزا کے لائق ہیں!!! اور غاصبوں کو ان کے جرم کے باوجود نہ صرف نظر انداز کر دیا جائے بلکہ ان کی پشت پناہی اور حوصلہ افزائی بھی کی جائے۔ واہ رے انصاف! ——ظلم صرف یہیں تک ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کی تمام تحریکوں کو ہی دہشت گرد تنظیم قرار دے کر ان کے خلاف سخت کارروائیوں کی دھمکیاں دی جائیں——ان سے منسلک افراد کو جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا جائے۔ اور انسداد دہشت گردی کا نام دے کر مسلم ممالک کو سبق سکھانے کی وارننگ دی جائے——کیا دنیائے انصاف کی نظر میں اس قسم کی دھمکی

بذات خود دہشت گردی نہیں ہے؟

یہ تمام واقعات ایسے ہیں جن سے اس عہد کا مسلمان نبرد آزما ہے۔اور آج تمام اسلام دشمن طاقتوں کے ذریعے ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت مسلمانوں کو بدنام، کمزور اور تباہ و برباد کرنے کے ارادے سے یہ سازش رچی گئی ہے —— کیا یہ بات دنیائے کے سامنے نہیں ہے کہ وقت کے سب سے بڑے ظالم اور ہلاکو و چنگیز کے نقش قدم پر چلنے والے امریکہ نے عراق و افغانستان کے عوام پر کس قدر مظالم ڈھائے ہیں۔اور آج بھی عراق، ایران، صومالیہ اور دیگر اسلامی ممالک کو دھمکیاں دے رہا ہے —— کیا اس وقت دنیا کے اندر حق و انصاف کی بات کہنے والا کوئی نہیں؟ —— کیا اس وقت امریکہ سے کوئی یہ سوال کرنے کی ہمت کر سکتا ہے کہ جس وقت سرب عیسائیوں کے ذریعے بوسنیا کی بیگناہ عورتوں کے دامن عصمت کو چاک کیا جارہا تھا۔ وہاں کے بچوں کو ذبح کیا جارہا تھا۔اس وقت انسانی ہمدردی کا جذبہ تمہارے اندر کیوں نہیں پیدا ہوا؟ —— اور ایک طویل عرصے سے لیکر آج تک اسرائیل معصوم فلسطینیوں کو اپنی بربریت کا نشانہ بنا رہا ہے۔تو اس سلسلے میں تم نے چشم پوشی کیوں اختیار کر رکھی ہے؟ —— یہاں میں امریکہ اور اس کے ہمدردوں سے بانگ دُہل کہنا چاہتا ہوں۔اے انسانی ہمدردی کا دُہرا معیار برتنے والو! —— تم مسلمانوں کو تو بے بنیاد باتوں پر اپنی جارحیت کا نشانہ بناتے ہو۔ اور اصلی مجرم اور انسانیت کے دشمنوں کو نظر انداز کرتے رہتے ہو۔اگر تم واقعی امن و آشتی کے دلدادہ ہو اور دنیا سے دہشت گردی اور تباہی کا خاتمہ کرنے میں سنجیدہ و مخلص ہو تو تمہیں چاہئے پہلے اسرائیل کو لگام دو اور طاقت کے زور پر اسے مجبور کرو کہ وہ مسلمان فلسطینیوں کے وطن عزیز سے اپنا غاصبانہ قبضہ ختم کرے۔اگر امریکہ واقعی انصاف کا علمبردار اور مظلوموں کا ہمدرد ہے تو اسے چاہئے کہ دنیا میں جہاں بھی مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے تو ان کے ساتھ بھی اظہار ہمدردی کرے اور عملی طور پر ان کی مدد کرنے کیلئے موثر قدم بھی اٹھائے —— اور اگر امریکہ ایسا نہیں کرتا تو پھر یہی سمجھا جائے گا کہ اس کی تمام صلاحیت و طاقت دہشت گردی کے خاتمے کیلئے نہیں بلکہ بے گناہ معصوم مسلمانوں پر قہر ڈھانے کیلئے ہے۔

☆☆☆☆☆

عظیم الشان وکامیاب سالگرہ کے موقع پر

انقلاب اسلامی ایران

کا

(ایک اجمالی تجزیہ)

دنیا میں رونما ہونے والے انقلابات کی ایک لمبی فہرست موجود ہے اور ہر انقلاب اپنی مخصوص نوعیت اور انفرادی خصوصیت کے ساتھ پہچانا جاتا ہے اور ہر انقلاب کے کچھ بنیادی اغراض ومقاصد ہوا کرتے ہیں جن کو نگاہ میں رکھتے ہوئے مذکورہ انقلاب کی کامیابی وناکامی کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ جب فرانسیسی انقلاب کا ذکر آتا ہے تو صنعت کاری کے میدان میں رونما ہونے والی ترقی کو اس انقلاب کی کامیابی کا معیار قرار دیا جاتا ہے اور جب روس کے انقلاب کی بات آتی ہے تو اقتصادی ترقی واشتراکی معیاروں کو کامیابی کی کسوٹی مانا جاتا ہے اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ وقت کی رفتار کے ساتھ اس انقلاب میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں اور انقلاب اپنے بنیادی اصولوں پر کس حد تک قائم رہا۔

ایران میں فروری ۱۹۷۹ء میں رونما ہونے والے انقلاب کی نوعیت ہر اعتبار سے بالکل واضح رہی ہے۔ ابتدائی مرحلہ سے ہی لوگوں کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ ملت اسلامیہ ایران سابقہ شاہی حکومت کی امریکہ غلامی اور اسلام دشمنی سے بیزار ہے اور ایرانی عوام ایسی حکومت کے خواہاں ہیں جو ان کے مذہبی اصولوں کا احترام کر سکے اور اسلامی قدروں کا مذاق اڑانے کے بجائے انھیں اسلامی معاشرہ میں رائج کرے۔ ایرانی سماج میں قرآن وسنت کا بول بالا ہو اور ملک کے ہر گوشے میں پرچم اسلام کو سربلندی حاصل ہو۔ حاکمیت کا حق صرف اور صرف خداوند عالم کی ذات سے وابستہ رہے اور حکومت کا کاروبار الٰہی قوانین کی روشنی میں آگے بڑھے اور الٰہی قوانین کی تفسیر وترجمانی کا کام علماء کے ہاتھ میں ہو اور ولایت فقیہ کی سرپرستی نیز عوام کی شرکت وحمایت کے سایہ میں جمہوری قدروں کو فروغ حاصل

ہو۔ سماج میں مردوں کی طرح عورتوں کو بھی زندگی کے ہر شعبہ میں تعلیم وترقی کی یکساں سہولت حاصل ہو۔ عورتوں کے سروں سے چادر نوچ کر پھینکنے کے بجائے ملک میں اسلامی حجاب کو فروغ دیا جائے۔ ملک کی مغرب زدہ اسلامی ثقافت کو خاص اسلامی ثقافت میں تبدیل کیا جائے اور ملک کے تعلیمی نظام کا ڈھانچہ پوری طرح اسلامی ہو۔

شائد یہی وہ اسباب وعوامل تھے جن کو نگاہ میں رکھتے ہوئے انقلاب کی کامیابی کے بعد قائد انقلاب امام خمینیؒ نے ملک کے تعلیمی نظام کی مکمل اصلاح نیز ہزاروں سال پرانی ایرانی ثقافت کو عالمی بالخصوص مغربی ثقافتی یلغار سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک نئے علمی ڈھانچے کی تشکیل کرائی۔ انھوں نے اس زمانے میں رائج تعلیمی نظام کی تردید کرتے ہوئے ملک میں ایک تعلیمی سال کو صفر قرار دیتے ہوئے سال بھر میں آئندہ دور میں رائج کیے جانے والے تعلیمی نظام کی تکمیل کرائی۔ اس ایک سال کے اندر آئندہ پڑھائی جانے والی درسی کتب کی تیاری اور اس سے متعلق قوانین واحکام آمادہ کرائے۔ اس وقت بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایرانی طالب علموں کا ایک تعلیمی سال خراب ہو گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس ایک سال کی مدت میں جو تعلیمی ڈھانچہ تیار کیا گیا اس کی تعمیل کی وجہ سے ایرانی طالب علموں کی علمی وثقافتی عظمت وسربلندی کا بیمہ ہو گیا اور دنیا کی نامور طاقتیں بھی اس میں کسی قسم کا خلل پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

اسی طرح اسلامی جمہوریت کی تشکیل میں انھوں نے کسی ایک سیاسی جماعت کا سہارا نہیں لیا بلکہ ایک عبوری حکومت کی تشکیل کے بعد انھوں نے حکومت کی نوعیت کے بارے میں قطعی طور پر ارشاد فرمایا "فقط جمہوری اسلامی، نہ ایک حرف کم نہ ایک حرف زیادہ۔" اور اس کے بعد انھوں نے ملک گیر پیمانے پر اس تجویز کی تصدیق کے لیے استصواب عامہ کا اہتمام کیا اور ملک کے ۹۸ فیصد سے زیادہ لوگوں نے اپنی بھرپور حمایت کے ذریعہ اسی نظام کو عوامی نظام کا روپ دیدیا۔ اپنے اس دانشمندانہ اقدام کے ذریعہ امام خمینیؒ نے آئندہ نسل کو یہ درس دیا کہ حکومت کسی ایک گروہ یا جماعت کی نمائندگی نہیں کرتی بلکہ پورے ملک کی نمائندگی کی ذمہ داری اس کے کندھوں پر ہوتی ہے لہٰذا عوامی حمایت کے بغیر جمہوریت کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔ بہر حال اللہ کی حاکمیت اور قرآن ورسول کی سیرت پر ٹھوس عقیدہ

وایمان کے ساتھ اسلامی جمہوریہ ایران نے آگے قدم بڑھایااور تقریباً چوتھائی صدی گزر جانے کے بعد بھی ملت اسلامیہ ایران یہ اعلان کرتی ہوئی نظر آتی ہے کہ یہ انقلاب امام خمینیؒ کے نام کے بغیر دنیا کے کسی گوشہ میں کوئی شناخت نہیں رکھتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ امام خمینیؒ نے جس راستہ پر چلنے کی ہدایت فرمائی تھی اس سے انحراف ہلاکت کا باعث ہو سکتا ہے لہٰذا انقلاب سے متعلق ہر سرگرمی پر بھرپور توجہ کی ضرورت ہے۔

یہ انقلاب اسلامی ایران کی عظیم الشان کامیابی کی ۲۳ویں سالگرہ کا موقع ہے۔ موجودہ صدی کا وہ انقلاب عظیم جس کو قائد و بانی انقلاب امام خمینیؒ نے ایران، عالم اسلام اور دنیائے بشریت کی تاریخ میں ایک عظیم معجزۂ الٰہی کے نام سے تعبیر کیا تھا۔ وہ انقلاب جس نے دنیا کی تمام اسلام پسند جماعتوں اور کمزور و پسماندہ لوگوں پر پوری طرح ثابت کر دیا کہ خداوند عالم کی لازوال قدرت و طاقت کے سہارے اور پرچم توحید و حقیقی اسلامی شریعت کے سایہ میں ملت اسلامیہ ایران خالی ہاتھ ہوتے ہوئے بھی دنیا کی ایسی طاقتور اور ظالم و بیرحم شاہی حکومت کو نیست و نابود کر سکتی ہے جس کو دنیا کی بڑی طاقتوں کی بھرپور حمایت حاصل تھی اور جو اربوں ڈالر کا قومی سرمایہ محض اسلحوں کی خریداری پر صرف کیا کرتی تھی۔ جی ہاں! اس انقلاب نے ملت ایران کو اسلامی معارف عالیہ سے مالا مال کر دیا اور اسے دوبارہ فطری ترقی و سیاسی بیداری حاصل ہو گئی اور اسے خود شناسی کا سرمایہ دوبارہ مل گیا کہ وہ کونسی قوم ہے اور اسے کیسا ہونا چاہئے چنانچہ امام خمینیؒ جیسے عظیم رہبر عالیقدر کی مثالی قیادت کے سائے میں ملت اسلامیہ ایران کی سماجی، سیاسی، ثقافتی، اخلاقی اور بالخصوص مذہبی تنظیموں میں بنیادی تبدیلی پیدا ہو گئی اور اس قوم نے اپنی بہادرانہ للکار اور ایثار گرانہ حوصلے کے ساتھ عالمی سامراج کا بھانڈا پھوڑ دیا اور سامراجی چنگل میں گرفتار دنیا کی دوسری قوموں کو استقلال و آزادی کا پیغام سنا دیا۔ اس انقلاب نے دنیا پر مسلط قدروں اور سیاسی نظام حکومت کو دگرگوں کرتے ہوئے اپنا مکمل اور حقیقی تعارف دنیا والوں کے سامنے پیش کر دیا اور دنیا والوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ امت اور امام کے درمیان کیسا اٹوٹ رشتہ ہے اور دونوں ہی اسلامی مکتب فکر سے اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ انہیں ہرگز جدا نہیں کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس انقلاب کی بنیاد ہی حقیقی اسلام محمدیؐ ہے۔ اسلامی انقلاب کی کامیابی سے قبل اور اس کے بعد جدید ترین

اطلاعاتی وسائل وامکانات سے مالامال مفکرین وماہرین سیاست نے اپنی بے بنیاد پیشین گوئیوں کے ذریعہ اس بات کی بھرپور کوشش کی کہ اس عظیم اسلامی انقلاب کو عالمی سطح پر مقبولیت نہ حاصل ہونے پائے اور دنیا والوں بالخصوص کمزور و پسماندہ طبقے کے، مفلس ومحروم لوگوں کو، ان کے جملہ تقاضوں کو پورا کرنے والی مذہبی نشاۃ ثانیہ اور نورانی دھماکہ کی بھنک تک محسوس نہ ہونے پائے کیونکہ اسلامی مکتب فکر کو دنیا میں رائج تمام دوسرے مادی مکاتب فکر مثلاً قومیت پسندی اور اشتراکیت وغیرہ پر فضیلت وبرتری حاصل رہی ہے اور اس میں انسانی معاشرہ کی تمام سیاسی، سماجی، اقتصادی، اخلاقی اور ثقافتی ضرورتوں کو پورا کرنے کی صلاحیت موجود ہے اور یہ انسان دوستانہ اور خداپسندانہ مقاصد کا حامل ہے اور اس مکتب کی پیروی کرنے والوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے ملک میں اپنی پسندیدہ حکومت کی تشکیل کے ساتھ اپنی قسمت کا فیصلہ آپ ہی کریں اور مکمل آزادی وذمہ داری کے ساتھ ملک وملت کی تعمیر وترقی میں سرگرم رہیں۔ انقلاب اسلامی ایران کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مذہب اسلام میں موجود ان صفات عالیہ کو عملی طور پر نمایاں کردیا تاکہ دنیا والے محض سنی سنائی باتوں اور اسلام دشمن پروپگنڈوں کی وجہ سے گمراہی میں پڑے نہ رہیں۔ اسلامی انقلاب کے متوالوں نے مذہب اسلام کے چہرے پر جمی ہوئی بے بنیادالزامات کی گرد کواپنے خون سے صاف کردیااوراسلام کے چہرے سے ساطع ہونے والے الٰہی نور نے دنیا کے نامور ماہرین سیاست کو بھی حیران کردیااوراپنے اسلام دشمن منصوبوں میں ناکام ہوگئے۔

اس طرح انقلاب نے اپنی عظمت وانفرادی ماہیت کے ذریعہ یہ ثابت کردیا کہ یہ انقلاب گذشتہ سولہویں، سترھویں، اٹھارویں اور انیسویں صدیوں میں سرزمین ہالینڈ، برطانیہ، امریکہ، روس اور فرانس میں رونما ہونے والے انقلابات سے بالکل مختلف ہے، اسی سے اس نے سرمایہ دارانہ نظام اور قرون وسطٰی کی بدعنوانیوں کو پوری طرح نابود کردیا اور آزادی واستقلال پسندی کی ایسی لہر پیدا کردی کہ ایرانی سرحدوں سے ہزاروں میل کے فاصلے پر زندگی بسر کرنے والے انصاف پسند ماہرین سیاست بھی اس کی عظمتوں کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوگئے اور اس سے متاثر ہوکر عالمی سطح پر آزادی طلب تحریکوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا اور عالمی نظام بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ عالمی سامراج نے اس

کی راہ میں طرح طرح کی تکنیکی اور اقتصادی دشواریوں کا جال پھیلایا لیکن اسے ہر میدان میں مایوسی ونامرادی کے علاوہ کچھ نہ مل سکا اور یہ انقلاب اپنے داخلی اور خارجی دشمنوں اور ان کے سازشانہ وظالمانہ ہتھکنڈوں کو بے نقاب کرتے ہوئے آگے بڑھتا رہا اور فوجی بغاوت کی تمنار کھنے والے منافقین اور ان کی حمایت وپشت پناہی میں لگی ہوئی عالمی اسلام دشمن طاقتوں کی ذلت آمیز شکست کی زمین ہموار کرتا رہا۔ فقط یہی نہیں بلکہ ایک عظیم امت کی حیثیت سے ملت اسلامیہ ایران نے اپنے جانی دشمن کی زبان سے اپنی عظمت کا لوہا منوالیا۔ کیادنیا سابق اسرائیلی وزیر خارجہ بیگن کے اس اعتراف کو فراموش کرسکتی ہے۔ کہ "اسلامی انقلاب نے علاقے میں ایسے زلزلے پیدا کردئے ہیں جن کی اہمیت معاہدہ کیمپ ڈیوڈ سے زیادہ ہے لہٰذا ہمیں ان کا مقابلہ کرنا چاہئے۔اسی طرح سابق وزیر خارجہ امریکہ کیسینجر یہ کہتا ہوا نظر آتا ہے کہ "ایران کا اسلامی انقلاب امریکی مفاد ومصالح کے لئے ایک خطرناک دشمن کی حیثیت رکھتا ہے۔" اسلامی انقلاب کی عظمت واہمیت کے اعتراف کا یہ سلسلہ فقط امریکی اور اسرائیلی ماہرین سیاست تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ سابقہ سوویت یونین کے صدر اور کیمونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری برژنیف کا یہ بیان تاریخ کے صفحات میں درج ہے کہ "اسلام کی تجدید وحیات میں ۲۰ ویں صدی کا وہ اہم ترین سیاسی حادثہ ہے جو سوویت یونین کی جنوبی سرحدوں کے لئے ایک براہ راست خطرہ ہے۔"

اسلامی انقلاب کے سلسلے میں دشمنوں اور دوستوں کی طرف سے جاری کئے گئے ان بیانات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ انقلاب، اسلامی نظام کی سیاسی طاقت پر مشتمل ایک ایسی عظیم واقعیت ہے جس کو کرشمۂ الٰہی کہا جانا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ پندرھویں صدی میں اسپین کے زوال کے بعد اسلامی نظام کی سیاسی طاقت روز بروز گھٹتی جارہی تھی اور سلطنت عثمانیہ کے عبرت ناک زوال کے بعد دنیائے اسلام پر مغربی سامراج کا غلبہ، ایک حقیقت کی حیثیت سے ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔

موجودہ صدی میں اسلامی انقلاب کی عظیم الشان کامیابی نے اس کہنہ ذہنیت اور طرز فکر کی عملی تردید بھی پیش کردی کہ اسلام ایک رجعت پرست مذہبی حادثہ کا نام ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ اس انقلاب نے دنیا کے لاکھوں مظلوم وستمدیدہ لوگوں میں امید کی نئی کرن پیدا کردی اور اسلامی ثقافت

کے متوالے اسلام پر کئے جانے والے منطقی اعتراض کا عملی جواب فراہم کرتے چلے جارہے ہیں اور پوری دنیا کی ٹھیکیداری کا دم بھرنے والی طاقتیں اس انقلاب کے مقابلے میں ہر محاذ پر شرمناک شکست سے دوچار ہورہی ہیں۔ واضح رہے کہ اسلام کو ارتجاعی طاقت خیال کرنے والے امریکی حکمرانوں نے سابق شاہی حکومت کو بھی یہی سمجھا رکھا تھا کہ اسلام قدیم و فرسودہ خیالات پر مشتمل رہا ہے اس کے ماننے والوں کو علاج انسانی طریقوں سے نہیں بلکہ انہیں طاقت کے ذریعہ کچل دیا جانا چاہیے شاہی حکومت کے جلاد صفت افسران، اسلام، اسلامی انقلاب اور ملت اسلامیہ اسی امریکی راہ وروش پر گامزن رہے لیکن جب شہادت طلب نوجوانوں نے ایک عظیم سیلاب کا روپ اختیار کرتے ہوئے اسلام کی راہ پر آگے بڑھنا شروع کیا اور ایران کی فضا میں اللہ اکبر کی آواز ہر طرف گونجنے لگی تو دنیا کی بڑی سے بڑی استکباری طاقت شاہی حکومت کو نابودی کے گڑھے میں گرنے سے نہ بچاسکی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان لوگوں نے شاہی حکومت کو، جو اس علاقے میں امریکی مفاد و مصالح کی نگہبان تھی، بچانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن خون نے شمشیر پر اور خالی ہاتھ شہادت طلب نوجوانوں نے آگ اگلتی ہوئی توپ کے گولوں پر کامیابی حاصل کرلی اور ایران میں، ایرانی عوام کی خواہش کے مطابق اسلامی جمہوری نظام حکومت قائم ہوگیا جس کا مقصد اسلامی تعلیمات کے سایہ میں ملک و ملت کی ترقی و خوشحالی کے لئے کام کرنا اور ہر مرحلہ میں اسلام اور اسلامی ثقافت کا دفاع کرتے ہوئے اسلام دشمن طاقتوں کے جھوٹے الزامات اور بے بنیاد اعتراضات کا منہ توڑ عملی جواب فراہم کرنا رہا ہے۔

ایران میں اسلامی جمہوری حکومت کی تشکیل کے کچھ ہی دنوں بعد اس ملک پر تباہ کن جنگ مسلط کردی گئی اور دوسری طرف اس ملک کی اقتصادی ناکہ بندی بھی کردی گئی لیکن ایران اقتصادی ناکہ بندی اور آٹھ سالہ دفاع مقدس کے دوران بھی اپنے اسلامی موقف پر اٹل رہا۔ منافقین کے ذریعہ بم دھماکوں کا انتظام کرکے اسلامی انقلاب کے حقیقی خدمت گزاروں کو خاک و خون میں غلطاں کیا گیا اور صدر رجائی و وزیر اعظم باہنر کو بم دھماکوں کے دوران شہید کرڈالا گیا لیکن ملت ایران اسلامی تعلیمات اور امام امت کی دانشمندانہ قیادت کے سایہ میں اپنے موقف پر ثابت قدم رہے۔ وہ وقت بھی آیا کہ ملت ایران اپنے قائد عظیم الشان کے وجود سے محروم ہوگئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امام خمینیؒ کی

رحلت ایرانی حکومت اور عوام کے لئے ایک آزمائش کی گھڑی تھی اور دوسری طرف عالمی سامراج بھی اس پروپگنڈہ میں سرگرم تھا کہ امام کی وفات کے بعد اسلامی انقلاب کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا۔ ان لوگوں کو اس حقیقت کا اندازہ نہیں تھا کہ اس انقلاب کی بنیاد اسلام و قرآن ہے اور امام خمینیؒ نے اسلامی شریعت اور قرآنی احکام کے مطابق اسلامی جمہوری حکومت کا ڈھانچہ تیار کیا ہے اور اسلام خالق کائنات کا پسندیدہ ترین دین اور قرآن وہ مقدس کتاب الٰہی ہے جس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خداوند عالم نے لے رکھی ہے۔ بہر حال امام خمینیؒ کی وفات کے بعد ملک و ملت کی قیادت کی ذمہ داری آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای نے قبول کرلی اور اسلامی جمہوریہ ایران نے ان کی قیادت میں تعمیر و ترقی کی منزلیں طے کرنا شروع کر دیا۔

آخر کلام میں یہ عرض کر دینا لازمی معلوم ہوتا ہے کہ جس اسلامی انقلاب کو ایران کی سرحدوں کے اندر محدود کرنے کی کوشش کی گئی وہ آج دنیا کے ہر گوشے میں مقبول اور کم از کم اپنی شناخت کو قائم رکھنے میں پوری طرح کامیاب ہے۔ اس انقلاب نے جب اتحاد امت اسلامیہ کا نعرہ دیا تو مختلف قسم کے متعصبانہ پروپگنڈوں کے ذریعہ اس ملک کو دیگر اسلامی ملکوں سے دور رکھنے کی کوشش کی گئی لیکن اسلامی جمہوریہ ایران نے عملی نمونوں کے ذریعہ اسلامی ملکوں کی بدگمانیوں کو دور کرنے کی کوشش جاری رکھی اور موجودہ صدر جمہوریہ اسلامی ایران حجت الاسلام سید خاتمی کی قیادت میں تہران میں اسلامی کانفرنس تنظیم (Organization of Islamic Conference) سے وابستہ مسلم ممالک کے سربراہوں کے اجلاس کا انعقاد یقیناً ایران کی بہت بڑی کامیابی اور اس بات کی سند ہے کہ ایران کو گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور نہیں کیا جاسکا۔ اور یہ بات صرف مسلمانوں کے درمیان اتحاد قائم کرنے کی نہیں ہے۔ بلکہ اسلام تو اس آفاقی پیغام الٰہی کا نام ہے جس کا تعلق پوری دنیائے انسانیت سے ہے لہٰذا اسلام کی اسی انسانیت دوستی کو بنیاد قرار دیتے ہوئے صدر جمہوریہ ایران سید محمد خاتمی نے اقوام متحدہ کے ۱۹۹۹ء اجلاس میں یہ تجویز پیش کی کہ آئندہ صدی کے پہلے سال کو ''دنیا میں موجود مختلف تمدنوں کے درمیان مذاکرہ و گفتگو کا سال'' قرار دیا جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں صدر محترم جمہوریہ اسلامی ایران کی یہ تجویز متفقہ طور پر تسلیم کرلی گئی اور

۲۰۰۱ء کو ''عالمی تمدنوں کے درمیان گفتگو کا سال'' اعلان کر دیا گیا۔ واضح رہے کہ دنیا میں چل رہے مہلک اسلحوں کے ماحول میں بھی اسلامی جمہوریۂ ایران کی یہ تجویز اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلامی قوانین پر کاربند ایران، عالمی امن وسلامتی کا خواہاں ہے اور یہی راہ اسلام ہے۔ ہر طرح کے ہنگاموں کے باوجود ایران نے عالمی سطح پر تمدنوں کے درمیان گفتگو کا سلسلہ پورے سال قائم رکھا اور اس کے اچھے نتائج بھی سامنے آئے اور آئندہ بھی آتے رہیں گے۔

واضح رہے کہ ایرانی عوام اپنے عظیم انقلاب کی کامیابی کے آخری مراحل میں تھے۔ شاہ سرزمین ایران سے فرار اختیار کر چکا تھا اور اپنی جگہ شاپور بختیار حکومت بنا کر گیا تھا جو بار بار یہ اعلان کر رہا تھا کہ سردست ایران کے حالات ایسے نہیں ہیں کہ ملک میں امام خمینیؒ کی حفاظت کا انتظام کیا جا سکے لہٰذا انہیں فی الحال ایران آنے کا فیصلہ ترک کر دینا چاہئے۔ دوسری طرف امام خمینیؒ کے اردگرد جمع مغربی سامراجیت کے طرفدار بھی درپردہ اور نہایت ہلکی آواز میں امام خمینیؒ کو اپنے ارادہ میں اور زیادہ اٹل بنا دیا چنانچہ وہ اپنے سابقہ ارادہ کے بموجب یکم فروری ۱۹۷۹ء کو ایران پہونچ گئے کیونکہ انہیں اللہ کی حفاظت اور ایرانی عوام پر بھروسہ تھا اسی وجہ سے ان کی حفاظت کا انتظام حکومت نہیں بلکہ عوام کے سپرد تھا اور حفاظتی امور کی نظارت وسرپرستی کا کام ایسے لوگوں کے سپرد تھا جو دنیا کی کسی طاقت پر بھروسہ کرنے کے بجائے خداوند عالم کی لایزال طاقت پر بھروسہ کرتے تھے۔

سرزمین ایران پر قدم رکھتے ہی انہیں اپنے وہ ساتھی یاد آگئے جو راہ انقلاب میں شہادت سے آغوش ہو کر بہشت زہرا نامی قبرستان میں آرام فرما تھے۔ انہوں نے انقلاب کی راہ میں جان نچھاور کرنے والوں سے اپنے اسلامی والٰہی معاہدہ کی تجدید کی خاطر بہشت زہرا جانے کی خواہش کی اور بہشت زہرا میں مختصر تقریر کے دوران اسلامی انقلاب کی راہ میں قربانی پیش کرنے والوں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے بعد تہران میں واقع مدرسۂ علویہ میں سکونت اختیار کی اور ایرانی حکومت اور زمینی، بحری ہوائی فوج سے یہ اپیل کی کہ کسی طرح کے خون وخرابہ کے بغیر اقتدار کی باگ ڈور سپریم انقلابی کاؤنسل کے سپرد کر دیں چنانچہ ایسا ہی ہوا اور دیکھتے ہی دس دن کی مختصر مدت میں ایران حکومت کی باگ ڈور امام خمینیؒ کے ہاتھوں میں آگئی اسی وجہ سے ایرانی عوام انقلاب کی سالگرہ کے موقع پر ہر سال پہلی فروری سے دسویں

فروری تک ''دھہ ٔ فجر'' نامی تقریبات کااہتمام کرتے ہیں۔واضح رہے کہ انہوں نے حکومت کی نوعیت کے سلسلے میں انقلابی جماعتوں کے درمیان نظریاتی اختلافات کو اس ایک جملے سے ہمیشہ کے لئے ختم کردیاکہ ''فقط جمہوری اسلامی، نہ یک حرف کم نہ یک حرف زیاد'' یہ بات صرف ان کے اس ایک جملے تک ہی محدود نہ رہی بلکہ انہوں نے ملک گیر پیانے پر ''استصواب عامہ'' کرایاجس میں ملک کی ۹۸٪ سے زیادہ آبادی نے ''اسلامی جمہوریت'' کی حمایت کااعلان کیا۔اس کے بعد انھوں نے قرآن کریم اور سیرت محمد و آل محمد پر مبنی آئین کی تشکیل کاکارنامہ انجام دیااوراس کے بعد ایرانی حکومت کیلئے کچھ بنیادی اصول مرتب کر کے حکومتی امور میں مداخلت سے علیحدگی اختیار کرلی۔

اس مختصر داستان کوپڑھنے کے بعداس انقلاب کی عظمت وافادیت کاقدرےاندازہ لگایاجاسکتا ہے کہ قائد انقلاب نے اپنی مخصوص حکمت عملی سے رقص وسرود میں تھرکنے والی ٹانگوں کو اسلامی حجاب کادلدادہ کیسے بنادیا۔شراب وکباب کے متوالوں پر ایسا کونسا جادو کیاکہ مسجد و محراب کے عاشق ہوگئے۔انھوں نے تہران میں واقع اسرائیلی سفارت خانہ کو فلسطینی مجاہدین کامرکز بناکر مسئلہ ٔفلسطین کو زندۂ جاوید کیسے بنادیااوروہ قوم جوامریکی بریڈ سے ہر صبح ناشتہ کرتی تھی اورامریکی پانی سے اپنی پیاس بجھایا کرتی تھی وہ امریکہ سے اس قدر متنفر کیوں ہوگئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی انقلاب کے ذریعہ امام خمینیؒ نے ابتدائی مرحلہ میں ایرانی عوام کی آنکھوں کے سامنے سے ظاہری تزک بھڑک کے پردے کو ہٹادیا جس کی وجہ سے اسلامی انقلاب ان کے شعور کی گہرائیوں میں اترتاچلاگیا۔اس کے بعد ان پر کسی پروپگنڈہ یاکسی دھمکی کاکوئی اثر نہیں ہوا۔چنانچہ آج جس دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے اور دنیا کے کونے کونے میں مسلمانوں کا قتل عام کرانے کی کوشش کی جارہی ہے کل دنیاکی نام نہاد دہشت گردی مخالف تنظیمیں سرزمین ایران میں اس دہشت گردی کوایران کی اسلامی جمہوری حکومت کی نابودی کاذریعہ بنائے ہوئے تھیں۔یہ پرانی نہیں بلکہ گذشتہ دودہائیوں کی بات ہے کہ اسلامی انقلاب کے فوراًبعد آیت اللہ مطہری، آیت اللہ مدرس آیت اللہ بہشتی کے ساتھ امام خمینیؒ کے دیگر ۷۲ رفقاء کار، صدر محمد علی رجائی اور وزیراعظم محمد جواد باہنر جیسے لوگوں کو مسجد، پارلیامنٹ اور سرکاری دفاتر میں بم کے دھماکوں کے ذریعہ خاک وخون میں غلطاں کیاجاچکاہے اور حد یہ

ہے کہ سابقہ صدر جمہوریہ اسلامی ایرانی حجت الاسلام رفسنجانی اور ایران کے موجودہ قائد انقلاب آیت اللہ سید علی خامنہ ای کو بھی عالمی دہشت گردی اور خوفناک بم دھماکوں کا شکار بنایا چکا ہے اور ان کے سینوں پر دہشت گردی کا داغ آج بھی موجود ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کسی بھی دھمکی کے جواب میں رحمت خداوندی اور اپنے عوام کی بھرپور حمایت پر بھروسہ کرنے والی ایرانی حکومت نے واضح لفظوں میں یہ اعلان کرنے میں ذرہ برابر ہچکچاہٹ نہیں محسوس کی کہ دہشت گردی سے ہمارا بھی کوئی سروکار نہیں رہا ہے البتہ ہم دنیا کی نام نہاد طاقتوں سے بھی کبھی مرعوب نہیں ہوئے "ہم توکل بھی اللہ کے ساتھ تھے، آج بھی اللہ کے ساتھ ہیں اور آئندہ بھی اللہ کے ساتھ رہیں گے۔

☆☆☆☆☆

دنیائے علم وادب کی عظیم الشان شخصیت

قاضی سید نور اللہ شوشتری

حیات و خدمات

از: پروفیسر سید محمد عزیز الدین
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

قاضی سید نور اللہ مرعشی الشوشتری شریف کے فرزند تھے۔ ان کی والدہ کے نام کا کسی عالم نے ذکر نہیں کیا ہے۔ ان کے دادا سید نور اللہ شوشتر کے معروف و ممتاز عالم تھے۔ ایسے ریاضی داں تھے، حکیم تھے اور علوم دین میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ انھوں نے 'شرح زج جدید' صد باب اسطرلاب، اور ایک کتاب علم طب پر تصنیف کی جو جڑی بوٹیوں اور خوزستان کی آب و ہوا کی مناسبت سے طریقہ علاج سے تعلق رکھتی تھی۔ قاضی نور اللہ کے دادا کے بھائی، سید زین الدین نے زمین کے بندوبست پر ایک کتاب 'رسالہ در تحقیق آراضی انفال، اور تصوف پر ایک کتاب 'نفحات لاھوت، تصنیف کی۔ قاضی نور اللہ شوشتری کے والد سید شریف، شیخ ابراہیم بن سلیمان قطیفی کے شاگرد تھے جو اپنے وقت کے عالی مرتبہ مجتہد تھے۔ سید شریف کے چار بیٹے تھے۔ سید نور اللہ، سید اسماعیل، سید قطب الدین اور سید وجیہ الدین محسن۔ قاضی نور اللہ کے بزرگ تبرستان کے دار الحکومت آمل یا مازندران سے تعلق رکھتے تھے اور عباسی دور حکومت میں تشریف لائے تھے۔ آمل سے یہ خاندان شوشتر منتقل ہوا جو ایران کے خوزستان صوبے کا ایک شہر تھا۔ قاضی نور اللہ شوشتری نے ابتداء میں اپنے والد سے علوم دین اور معقولات کی تعلیم حاصل کی۔ طب کی تعلیم آپ نے حکیم عماد الدین سے حاصل کی۔ آپ کی دوسرے علوم کی تعلیم میر سیف الدین محمد اور میر جلال الدین محمد کی نگرانی میں ہوئی جو شوشتر کے صدر کے عہدے پر فائض تھے۔ ۱۵۷۱ء میں قاضی نور اللہ اعلیٰ تعلیم کے لئے شوشتر سے مشہد آگئے۔ مشہد میں

آپ اپنے وقت کے ایک مشہور و معروف عالم عبد الواحد کے ساتھ علمی کام میں مصروف ہو گئے۔ عبد الواحد بہت وسیع و عریض علاقے کی سیاحت کر چکے تھے اور عراق اور ایران دونوں کے نو مراکز علم کے علماء سے کسبِ فیض کر چکے تھے۔ انھوں نے حدیث، فقہ اور اصول فقہ پر اعلیٰ پایے کی کتابیں تصنیف کی تھیں اور ایک کتاب ریاضی کی بھی تالیف کی تھی۔ قاضی نور اللہ نے تکمیل علم میں بارہ سال مشہد میں گزارے۔ ۱۵۸۴ء کے دور میں مشہد متواتر یکے بعد دیگرے حادثات سے دوچار ہوا اور متواتر سیاسی بحران نے یہاں کے سکون و طمانیت کو ختم کر دیا ابھی شاہِ عباس تخت نشین نہیں ہوئے تھے، چنانچہ وہاں کی سیاسی ہلچل اور غیر یقینی حالات نے قاضی صاحب کو کسی زیادہ پر سکون جگہ منتقل ہو کر سکون اور یکسوئی سے اپنے علمی کام میں مصروف رہنے کی ترغیب دی۔ قاضی نور اللہ نے اس لیے دکن کو ترجیح نہیں دی کہ وہاں قاضی سلیمان اور میر محمد مومن جیسے ایرانی علماء پہلے ہی پہنچ کر اپنا اثر قائم کر چکے تھے۔ آپ نے مغل سلطنت کے دار الحکومت آگرہ کو چنا،۲ جس کے لیے صائب نے بہت صحیح کہا تھا۔

ہم چو عزمِ سفر ہند کہ در ہر دل ہست
رقص سودائے تو در ہیچ سرے ہست کہ نیست

(جیسے ہر دل میں ہندوستان جانے کی خواہش موجود ہے، اسی طرح ایسا کوئی دل نہیں ہے جو تیری محبت میں محو رقص نہ ہو)

ہمایوں کے ہندوستان میں دوبارہ داخلے سے ایرانی علماء اور امراء کے لیے مغل سلطنت کے دروازے کھل گئے، جو ہندوستانی تاریخ میں ایک اہم موڑ تھا۔ اس فیصلے نے ہندوستانی سیاسی، سماجی، ثقافتی اور علمی میدانوں میں تبدیلیوں کے لیے نئی راہیں کھول دیں۔ ایرانی علماء علوم دین اور علوم معقولات دونوں کے ماہر ہوتے تھے۔ ان علماء نے شاہی سرپرستی میں ایک نئی تعلیم کی بنیاد رکھی اور مدرسوں کے نصاب پر نظر ثانی کی۔ اس کے نتیجے میں خود اساتذہ اور طلباء دونوں کے طرز فکر اور سمجھ بوجھ میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ ایران میں تمام بڑے اور معروف شعراء۔ فردوسیؔ، اسدیؔ، نظامیؔ، سعدیؔ اور حافظؔ روشن خیالی، انسان دوستی امن و آشتی اور ہم آہنگی کے ترانے سنا چکے تھے۔ ایرانی شاعری نے ہندوستان اور ایران کے تعلقات میں ایک خوشگوار ماحول اور تقویت پیدا کر دی تھی۔ یہ وقت جب اکبر

(۱۵۵۶-۱۶۰۵ء) کا دربار ممتاز اور فاضل ماہرین طب، سائنس اور عمرانیات کے عالموں کا مرکز و مسکن تھا۔ اسی وقت اکبر نے "صلح کل" کی پالیسی اختیار کی تھی اور اس نے ہر شخص کو پوری آزادی سے کام کرنے کا اختیار اور سرپرستی فراہم کی تھی۔ مغل سلطنت کے پُرسکون اور اطمینان بخش ماحول سے متاثر ہو کر قاضی نوراللہ بھی ۱۵۸۴ء میں مشہد سے آگرہ ہجرت کر گئے۔ جیسا کہ ایک فارسی شاعر نے کہا تھا۔

خضر می دود برسر راہ آگرہ
کہ گردد دلیل ہوا خواہ آگرہ

(خضر خود اس مسافر کی مدد کرنے آگرہ کی شاہراہ پر دوڑے چلے آتے ہیں جسے آگرہ سے محبت ہوتی ہے)

قاضی نوراللہ غالباً ۱۵۸۴ء میں آگرہ پہنچے۔ انھوں نے اپنے ایک دوست بہاءالدین آملی کو لکھا تھا۔ "دور دراز کی مسافتیں طے کرتا ہوا اور کافی صعوبتیں اور پریشانیاں جھیلتا ہوا میں ہندوستان کے دارالحکومت پہنچ گیا ہوں۔ قسمت نے میرا ساتھ دیا۔ مہر درخشاں کی ذات بابرکت سے مجھے فیضیاب ہونے کا موقع نصیب ہوا اور شہنشاہ اکبر کے سایہ عاطفت میں مجھے سکون قلب میسر ہوا، خوشی سے میری آنکھیں نم ہو گئیں اور میں نے یہ اشعار کہے:

(اللہ اکبر - مادر وطن سے) صبح رخصت
کوہسار کی وادی میں کیسی بجلی چمکی تھی
جس کی چمک نے مجھے خیرہ کردیا تھا
اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ رات کی تاریکیوں
نے اپنے بازو نہیں پھیلائے تھے سورج چمک رہا
ہے اور دن کی روشنی پھیل چکی ہے۔" [۳]

فتح پور سیکری میں ان کے میزبان حکیم ابوالفتح گیلانی تھے۔ اب اس دور تک فتح پور سیکری مغل سلطنت کا علمی مرکز بن چکا تھا۔ مشہور و معروف علماء و فضلاء حکیم ابوالفتح گیلانی، شیخ مبارک، ابوالفضل، فیضی، عبدالرحیم، شاہ فتح اللہ، عبدالقادر، حکیم ہمام، حکیم علی، حکیم عین الملک وغیرہ اکبر کے دربار میں جمع تھے۔ فارسی شاعر کلیم نے لکھا تھا۔

نیست در ایران زمین سامان تحصیل کمال
تانیامد سوئے ہندستان حنا رنگین نشد

(ایران میں علم وکمال کی تحصیل کے ذرائع موجود نہیں ہیں، حنا بھی جب تک ہندستان نہ آئے رنگین نہیں ہوتی۔)

حکیم ابوالفتح گیلانی نے قاضی نوراللہ کو اکبر سے متعارف کیا۔ ۴ قاضی نوراللہ حضرت علی پر ایک کتاب تصنیف کرچکے تھے۔ انھوں نے اس کتاب کا عنوان اکبر کے نام کی مطابق سے 'جلالیہ' رکھا۔ ابوالفضل نے قاضی نوراللہ کو علماء کی اس فہرست میں شامل کیا ہے جو روایتی علوم کے ماہر تھے۔ ۵ ۱۵۸۵ء میں اکبر شمال، مغرب کی طرف روانہ ہوا اور واپسی کے سفر میں ۱۵۸۶ء میں لاہور پہنچنے کے لئے دریائے جہلم پار کیا۔ حکیم ابوالفتح گیلانی اور قاضی نوراللہ غالباً اس سفر میں اکبر کے ساتھ تھے۔ لاہور کے قاضی شیخ معین اکبر کو سلام کرنے حاضر ہوئے۔ اب وہ قضات کے فرائض کی انجام دہی کے لیے بہت بوڑھے ہوچکے تھے۔ وہ ایک عالم باعمل اور پاک طینت اور نیک دل شخص تھے۔ اکبر نے انھیں قاضی کے عہدے سے سبک دوش ہوجانے کی اجازت دے دی اور ان کی جگہ نوراللہ کو لاہور کا قاضی ۱۵۸۶ء میں مقرر کردیا۔ نوراللہ ایک ایسے شخص کا متبادل اور جانشین مقرر کیے گئے تھے جن کی عبد القادر بدایونی بڑی توقیر واحترام کرتا تھا۔ "شیخ معین انسانی قالب میں ایک فرشتہ تھے۔ وہ اپنے وظیفے کی ساری رقم، جس پر انھیں کامل اختیار تھا، ان کاتبوں پر خرچ کردیتے تھے جنھیں انھوں نے ان قابل قدر کتابوں کو نقل کرنے کے لیے ملازم رکھا ہوا تھا جنھیں بعد میں وہ طالب علموں میں تقسیم کردیتے تھے۔" ایسے کسی شخص کی جانشینی کرنا بڑا چنوتی بھرا کام تھا۔ ۶ نوراللہ کو لاہور کے قاضی کے عہدے پر تقرر خود ایک اور وجہ سے بھی اہمیت کا حامل تھا کیوں کہ یہ شیعہ فرقے سے تعلق رکھتے تھے، اور اب یہ کوئی راز نہیں تھا۔ نوراللہ نے خود لکھا ہے: " مجھے یقین ہے کہ چوں کہ اب ہندوستان میں ایک سلطان عادل کی حکومت ہے، اب تقیہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" ۷ حالاں کہ 'محضر' پر قاضی نوراللہ کے دستخط نہیں ہیں مگر مندرجہ بالا بیان سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قاضی نوراللہ بھی اکبر کو 'سلطان عادل' مانتے تھے۔ قاضی نوراللہ نے یہی رائے اپنی تالیف 'رسالہ اللمعۃ فی تحقیق صلوۃ الجمعہ' میں ظاہر

کی ہے۔۸ عبدالقادر بدایونی بھی اس سے بخوبی واقف تھے کہ نوراللہ شیعہ تھے۔، جس کا اظہار انھوں نے منتخب التواریخ، میں کیا ہے۔۹ یہ بات اہم ہے کہ ہندوستان میں سلطنت کے قیام سے اب تک قاضی کے عہدے پر کسی شیعہ کی تقرری کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ مولانا ضیاءالدین برنی نے 'تاریخ فیروز شاہی' میں لکھا ہے کہ ''غیر سنی مسلمانوں کو عہدہ نہیں دیا جانا چاہیے۔''۱۰ دہلی کے سلطان اور مغل شہنشاہ دونوں ہی حنفی فقہ کے پیرو تھے اور شعبۂ قضا کو فقہ حنفی کی بنیاد پر مانتے ہوئے اسی کے مطابق فیصلے کرتے ہوتے تھے۔ اس لیے صرف سنی علماء ہی قاضی کے عہدے پر فائض کیے جاسکتے تھے۔ قاضی نوراللہ نے صرف اپنے فقہ جعفری کے علم پر ہی اکتفا نہیں کیا تھا۱۱ بلکہ انھوں نے فقہ کے دوسرے مسلکوں- حنفی، ۱۲ شافعی، ۱۳ مالکی، ۱۴ اور حنبلی ۱۵ پر بھی پورا عبور حاصل کیا تھا۔ اور حنفی فقہ کا تو انھوں نے صرف مطالعہ ہی نہیں کیا تھا بلکہ اس پر ایک تنقیدی تحریر 'حاشیہ شرح الوقایہ فی فقہ الحنفیہ' بھی تحریر کیا تھا۔ ۱۶ اکبر نے ان کے اسلامی قوانین واصول پر عبور کو دیکھ کر ہی، ان کے شیعہ ہونے کے باوجود، قاضی کے عہدے پر تقرر کیا تھا۔ بقول مرزا محمد علی ''قاضی نوراللہ شوشتری نے اکبر کو بتلا دیا تھا کہ وہ صرف ایک مکتب فقہ کے پابند نہیں رہیں گے۔ پھر بھی وہ حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی فقہوں کی حدود سے باہر کوئی فیصلہ نہیں کریں گے۔''۱۷ یہ کوئی خاص مسئلہ نہیں تھا اور بعد کے دور میں بھی ہمیں ایسے فیصلے نظر آجاتے ہیں ہمیں اورنگ زیب کے دور حکومت (۱۷۰۷-۱۶۵۸) میں ایسی ایک اہم مثال نظر آتی ہے۔ اورنگ زیب نے لکھا تھا'' یہ فیصلہ حنفی قوانین کے مطابق ہے، اس مقدمے کا فیصلہ کسی دوسرے مسلک کے اعتبار سے کرو تاکہ قلمرو سے گرفت نہ چھوٹے۔ ہمارا تعلق کٹر شیعہ فرقے سے نہیں ہے کہ پورے قریہ میں صرف ایک ہی درخت ہو، الحمد للہ ہمارے چار مکتب قوانین ہیں۔'' اس تحریر کے بعد قاضی نے اعلان کردیا کہ جنگی قیدیوں (ہندو مسلمان دونوں) جو، عبرت کے لیے قتل کردیا جائے،۔ جس پر بادشاہ نے لکھا ''میں متفق ہوں'' انہیں قتل کردیا جانا چاہیے۔''۱۸

عبدالقادر بدایونی نے نوراللہ کے قاضی کے عہدے پر تقرری کے سلسلے میں کوئی تنقید نہیں کی۔ بلکہ حقیقت میں انھوں نے ایک قاضی یا جج کی حیثیت سے نوراللہ کے اوصاف کی تعریف ہی کی

ہے۔اپنی کتاب کے دیباچہ میں بدایونی لکھتا ہے ''میں ان لوگوں سے مخاطب ہوں جو صحیح المزاج، زود فہم اور انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنے کے عادی ہیں۔''۱۹ اور یہ لکھ کر وہ جو کچھ لکھنا چاہتا تھا اور جس طرح چاہتا تھا لکھتا ہے۔''انصاف کی بات تو یہ ہے کہ انھوں (شوشتری) نے لاہور کے گستاخ مفتیوں اور عیار ومکار محتسبوں کو، جو فرشتوں کے استاد (ابلیس) کو بھی سبق پڑھانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ نظم وضبط میں باندھ دیا ہے اور رشوت کی تمام راہیں بند کر کے انہیں قواعد میں ایسا جکڑ دیا ہے جیسے مغز کسی خول میں بند ہوتا ہے اور اس حد تک نظم وضبط عائد کر دیا ہے کہ جس سے زیادہ تصور میں نہیں آسکتا۔''۲۰ اس تنقیدی جملے میں بدایونی نے بیک وقت قاضی نور اللہ شوشتری کے نیک اوصاف پر روشنی ڈالتے ہوئے ان سنی علماء کو بھی سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے جو مفتیوں اور محتسبوں کے عہدوں پر فائز تھے۔ بدایونی نے اس نکتے کی وضاحت اپنی کتاب کے تعارف میں اس طرح کی ہے۔''میری ان سے کوئی غرض نہیں ہے جو شریعت کے پابند نہیں ہیں، اور جو اسے اصولی اور عملی طور پر تسلیم نہیں کرتے۔''۲۱ ان کے اس اظہار رائے سے بالواسطہ طور پر ان بدعنوانیوں اور بے ایمانیوں کی حدود کا اندازہ ہوتا ہے جو عہد اکبری میں لاہور میں عام تھیں۔ بدایونی نے بے ایمان اور رشوت خوروں کو کرسی انصاف پر بیٹھے دیکھا تھا۔ اس نے محسوس کیا ہوگا کہ اگر ایسے غیر معمولی حالات میں دربار کی مثال اور اس کے اثرات سے 'سرکاری علماء' اور ان کے شریعت پر قائم رہنے اور اس کے نفاذ کے خلاف عوام کے جذبات کو تقویت مل گئی تو شریعت، جس پر مسلمان کی زندگی کا انحصار ہے، خود ہی ختم ہو جائے گی۔ بدایونی ایسے علماء-خواہ وہ سنی ہوں یا شیعہ — کے خلاف سخت تنقید کرتے ہیں۔انھوں نے ایسے علماء کی موت پر ان کے مادۂ تاریخ لکھتے وقت بھی انہیں تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔انھوں نے شیخ ابراہیم چشتی کو ''شیخ ممسک''اور شیخ گدائی کو''جسم خنزیر'' کے مادہ تاریخ سے یاد کیا ہے۔۲۲ بدایونی نے قاضی نور اللہ کی علمیت اور پاکیزگی پر ان الفاظ میں اظہار رائے کیا ہے گو کہ یہ مذہباً شیعہ ہیں مگر اپنی غیر جانبداری، عدل وانصاف، پاکبازی ،انکساری، نیک طینتی، زہد و تقویٰ اور ایسے اوصاف میں ممتاز ہیں جو شریف النفس افراد کا شیوہ ہوتے ہیں اور یہ اپنے علم، حلم، زود فہمی، فہم وفراست، صفائے قلب، جودت طبع اور دقیقہ رسی کے لئے عالم میں مشہور ہیں، اور انھوں نے فیضی کی 'تفسیر بے نقط' پر رسالہ تحریر کیا ہے اس کی توصیف وتعریف بیان

کی حدود سے باہر ہے۔ انھیں شاعری سے بھی شغف ہے اور بہت مؤثر شاعری کرتے ہیں۔" ۲۳ علماء بدایونی کے چٹکلے اور طنزیہ ان کی بڑی ممتاز خصوصیت ہیں۔ بدایونی کچھ چھپانے یا کسی قسم کا پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ وہی لکھتے تھے جو محسوس کرتے تھے۔ ان کا نہ کسی طبقے سے تعلق تھا اور نہ انھیں کسی کو خوش یا مطمئن کرنے سے دلچسپی تھی۔

۱۵۸۶ء میں مغلوں نے کشمیر فتح کیا اور محاصل بندوبست طریقۂ کار وہاں رائج کیا گیا مگر اکبر کی اصلاحات میں بدانتظامیوں اور مالی خرد برد اور بدعنوانیوں نے رکاوٹیں پیدا کرنی شروع کردیں۔ اکبر نے قاضی نوراللہ کو تحقیقات کے لئے مقرر کیا۔ ۱۵۹۱ء میں قاضی نوراللہ اور قاضی علی تحقیقات کرکے رپورٹ تیار کرنے کیلئے کشمیر بھیجے گئے۔ قاضی نوراللہ نے شعبۂ محاصل کے افسروں کی بدعنوانیوں اور غبنوں کی اطلاعات شہنشاہ کو بھیج دیں۔ ان تحقیقات کے بعد قاضی نوراللہ تو واپس آگئے مگر قاضی علی کشمیر میں ہی رہے۔ جن لوگوں کو ان دونوں سے نقصان پہنچا تھا وہ ان کے اتنے دشمن ہوگئے کہ قاضی علی کو قتل کردیا۔ ۲۴

۱۵۹۹ء میں قاضی صاحب کو آگرہ کی فوج کا قاضی مقرر کردیا۔ ۲۵ اس طرح قاضی نوراللہ کے مختلف حیثیتوں میں دیانت داری سے کام کرنے کے نتیجے میں ان کے بہت سے دشمن پیدا ہوگئے۔

ہندوستان آنے سے پہلے بھی انھوں نے کچھ کتابیں لکھی تھیں۔ یہاں آکر انھوں نے متعدد علوم پر بہت کچھ لکھا: تفسیر، قرآن، حدیث، ریاضی، منطق، فلسفہ، تاریخ، صرف و نحو، اور دیگر مضامین میں وہ متواتر لکھتے رہے۔ ان کی بہت سی معروف کتابوں میں 'مجالس المومنین' بھی ہے۔ اس کے چھٹے باب میں انھوں نے تصوف پر بحث کی ہے جو بذات خود ایک اہم کام ہے۔ قاضی نوراللہ بڑے پائے کے شاعر بھی تھے۔ ان کے کچھ اشعار یہاں نقل کیے جارہے ہیں۔

عشق تو نہالی است کہ خواری ثمر اوست
من خاری ازان بادیہ ام کاین شجر اوست
برمائدہ عشق اگر روزہ کشائی
ہشدار کہ صد گونہ بلا ما حضر اوست
دہ کاین شب ہجر یو برماچہ دراز است

گوئی کہ مگر صبح قیامت سحر اوست
فرہاد صفت این ہمہ جان کندن نوری
در کوہ ملامت بہ ھوای کمر اوست
شکر خدا کہ نور الٰہی رہبرم
وزنار شوق اوست فروزندہ گوہرم
اندر حسب خلاصۂ معنی وصورتم
واندر نسب سلالۂ زہرا وحیدرم
دارای دھر سبط رسولم پدر بود
بانوی شہر دختر کسری است مادرم
شائستہ ہست آنہم ازان ناخلف کہ گفت
شائستہ میوۂ دل زہرا و حیدرم

۱۶۰۲ء میں جہانگیر کے حکم سے ابوالفضل کو بیر سنگھ بندیلا اور سادات بارہہ کے ایک سید کے ہاتھوں قتل کیا گیا۔ ابوالفضل کی موت صرف اکبر کے لیے ہی ایک شدید صدمہ نہیں تھی بلکہ قاضی نوراللہ کے لیے بھی زبردست نقصان کا پیش خیمہ تھی۔ ان کے زیادہ تر دوست۔ فتح اللہ، حکیم ابوالفتح گیلانی، قاضی علی، فیضی، ابوالفضل وغیرہ یا فوت ہو چکے تھے یا قتل کر دیے گئے تھے۔ ۱۶۰۳ء میں انھوں نے ایران واپس ہونے کا فیصلہ کر لیا مگر اکبر نے انھیں اجازت نہیں دی۔ ۲۶ اس کی دو وجوہات ہو سکتی تھیں، اکبر ایک اور عالم کو نہیں کھونا چاہتا تھا، پھر یہ کہ اگر وہ چلے گئے تو انھیں راستے میں قتل کر دیے جانے کا خطرہ ہو سکتا تھا، جیسا کہ بیرم خاں کے ساتھ ہو چکا تھا۔ اکبر کے انتقال کے دو سال بعد قاضی نور اللہ کو یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اب ان کا کوئی دوست باقی نہیں بچا اور وہ ہر طرف سے دشمنوں میں گھر چکے ہیں۔ لاہور میں بحیثیت قاضی، کشمیر میں بدعنوانیوں کے افسر تحقیقات اور فوج کے قاضی رہ چکنے کے بعد یہ صورت حال قدرتی بات تھی۔

جہانگیر کے عہد حکومت (۲۷-۱۶۰۵ء) میں بروز جمعہ ۱۸/ جمادی الثانی ۱۰۱۹ھ، ۷/ ستمبر ۱۰

۱۶ کو انھیں قتل کر دیا گیا۔۲۷

میر نور اللہ عالی انتساب   زین زمانہ بادل آگہ شد
سال رحلتش مظہر الحق زد رقم   عدن جای میر نور اللہ شد
ظالمی اطفای نور اللہ کرد   قرۃ العین نبی را سر برید
نو بادہ' باغ مصطفیٰ نور اللہ   شاہی ظالم شہید کردش ناگاہ
سال قتل حضرتش ضامن علی   گفت نور اللہ سید شد شہید

در عہد جہانگیر بادشاہ بسعادت شہادت فائز شدند۔

بہر حال بڑی عجیب بات ہے کہ جہانگیر نے اپنی تزک میں قاضی نور اللہ کا ذکر نہیں کیا۔ انہیں کربلا کے بالمقابل، جہاں آج دیال باغ (آگرہ) کا علاقہ ہے دفن کر دیا گیا۔۲۸ جب کہ کربلا ان کے مدفن سے اتنی قریب تھی تو انہیں کربلا کے اندر کیوں دفن نہیں کیا گیا؟ اس دور اور اس کے بعد کے مآخذ اس مسئلے پر خاموش ہیں۔ ۱۶۷۴ء میں قاضی صاحب کے انتقال کے ایک سو چونسٹھ سال بعد، سید محمد منصور حسینی نیشاپوری نے ان کی قبر پر ایک مقبرہ بنوادیا۔۲۹ ۱۹۵۴ء میں مولانا سید حامد حسین موسوی نے قاضی نور اللہ کے مزار میں دلچسپی لینی شروع کی۔۳۰ ۱۸۷۳ء میں علی نقی نے ان کے مزار کا ایک حصہ اور مسجد کی تعمیر کروائی۔۳۱

فرمود علی نقی مزارش تعمیر   گشتن جمیع مومنیش ہمرا
سال تعمیر این مبارک روضہ   جنات النعیم مرقد نور اللہ

''مرقد منور مضجع مطہر سید سندی عالی مقدار شہید والا تبار۔ بہار باغ امامت سحاب گلشن سیادت برق گشت زار اہل ضلالت۔ پیشوای فرقہ ناجیہ باسعادت یادگار شہسوار یثرب و بطحا چشم و چراغ شہید کربلا آفتاب آسمان ہدایت و رہبری ابو الفضائل سید نور اللہ شوشتری مضجعہ کہ در ۱۰۱۹ھ بدرجہ شہادت فائز و مرمت مرقد مطہرش در ۱۱۸۸ھ بشہود پیوست۔''

اسی سال 'قاموس الاخبار' میں مزار کی تعمیر کے لیے چندے کی ایک اپیل شائع ہوئی۔ اس نتیجے میں کچھ افراد۔ مولوی سید اصغر علی۔ میر عنایت حسین، میر حسن علی، میر کمال الدین (قصبہ جلالی،

ضلع علی گڑھ) سید علی نقی اور دیگر حضرات نے مزار کی تعمیر کے لیے چندہ دیا۔ ۱۹۱۲ء میں آگرہ میں ''بھرت پور آگرہ سادات کانفرنس'' کا قیام عمل میں آیا اور اس کا پہلا اجلاس ۲۵ تا ۲۷ر دسمبر ۱۹۱۲ء میں مزار کے احاطے میں ہی منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں آگرہ۔ مہاجن، سید پور، پہر سر، بھرت پور، بیانا، ہیلک اور دھولپور کے سیدوں نے شرکت کی۔ اس اجلاس کی قرارداد نمبر ۱۰ میں قاضی نور اللہ کے مزار کے زائرین کیلیے ایک مسافر خانہ تعمیر کرنے کی تجویز پاس کی گئی اور قرارداد نمبر ۱۲ کے تحت بارہ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی، جسے مزار کی تعمیر کی دیکھ بھال کا کام سونپ دیا گیا۔ قرارداد نمبر ۱۳ کے تحت مولانا سید ناصر حسین سے، جو مزار کے معاملات میں پہلے ہی سے گہری دلچسپی لے رہے تھے، درخواست کی گئی کہ وہ مزار پر اپنی سرپرستی میں سالانہ جلسہ منظم کیا کریں۔ ۳۲-۱۹۱۲ء کے آس پاس ہی مولانا نے مزار کا ایک خوبصورت صدر دروازہ سنگ سرخ سے بنوایا جس پر سنگ مرمر کی مرصع کاری کی گئی تھی۔ اس کے بعد ان کے بیٹے مولانا سید الملت نے مزار کی خوبصورت عمارت بنوانے کے سلسلے میں کام کیا۔

قاضی سید نور اللہ شوشتری ایک عالم باعمل کردار کے مالک تھے اور اپنے علمی تبحر، زود فہمی، ذہنی یکسوئی، احساس و شعور کی تیزی اور صفائی اور فہم و فراست کے لیے مشہور تھے۔ انھیں ان کی بے لاگ غیر جانبداری، منصفانہ فکر، سادگی اور پاکبازی کے لیے بھی یاد کیا جاتا رہے گا۔

قاضی نور اللہ کے پانچ باصلاحیت لڑکے تھے۔ ان کے سب سے بڑے لڑکے سید شریف بہت اعلیٰ پایے کے عالم تھے۔ ایران کے قیام کے دوران شاہ عباس صفوی ان کی طرف متوجہ ہوئے اور انھیں شاہ کے دربار میں پیش کیا گیا۔ لیکن قاضی نور اللہ نے اپنے بیٹے پر زور ڈالا کہ وہ حکومت میں شامل نہ ہوں بلکہ خود کو اعلیٰ تعلیم کے حصول اور دانشورانہ مباحثہ میں مصروف رکھیں۔

۱۶۰۶ء میں وہ ہندوستان واپس آگئے۔ اپنے والد کے قتل کا ان پر اتنا شدید صدمہ ہوا کہ ان کا انتقال صرف اٹھائیس سال کی عمر میں ۱۶۱۱ء میں ہوگیا۔ سید شریف 'حاشیہ تفسیر بیضاوی، حاشیہ قدیمہ'' کے مصنف تھے۔ انھوں نے نو مختلف مذاہب پر ایک رسالہ بھی تالیف کیا تھا۔ قاضی صاحب کے دوسرے بیٹے سید محمد یوسف شاعر تھے۔ ان کے تیسرے بیٹے علاء الملک نے شیراز میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور پھر ہندوستان واپس آگئے۔ انھوں نے آگرہ میں ہی تعلیم و تعلم کو اپنا پیشہ بنایا۔ بعد میں انھیں مغل

بادشاہ شاہ جہاں (۵۸-۱۶۲۷ء) کے بیٹے شہزاد شجاع کا اتالیق مقرر کر دیا گیا۔ یہ "انوار الہدیٰ، سیرت الواصل فی اثبات الواجب، مہذب المنطق، اور فردوس، تاریخ شیراز کے مصنف تھے۔ ان کیچوتھے بیٹے ابوالمعالی کچھ عرصہ تک قطب شاہی حکمرانوں کے دربار میں رہے جہاں انھوں نے مصائب النواصب، کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ یہ 'شرح الفیہ' رسالہ فی العدل" رسالہ نافع ... واجب ... 'اور 'تفسیر الی سورۃ اخلاص' کے مصنف تھے۔ قاضی صاحب کے پانچویں بیٹے میر علاء الدولہ شاعر تھے۔

شد آن کہ اہل نظر بر کنارہ میر فتند
ہزار گونہ سخن در زبان ولب خاموش
بہ بانگ چنگ بگوئیم بر حکایتہا
کہ از نہفتن آن دیگ سینہ می زد جوش
شراب خانگی از ترس محتسب خوردن
بروی یار بنو شیم و بانگ و بانگ نوشانوش

قاضی نور اللہ شوشتری کی علمی خدمات:

شہید ثالث قاضی نور اللہ شوشتری، نادر الوجود شخصیت کے مالک تھے۔ اتنی جامع صفات شخصیت خال خال ہی نظر آتی ہے۔ آپ نے اپنے دور کے ہر میدان میں اپنی شخصیت کا لوہا منوایا۔ آپ بلند پایہ عالم، بہترین خطیب، اعلیٰ منظم، بے مثال قاضی، جذاب شاعر اور کم نظیر صاحب قلم... تھے۔

آپ نے اپنے دور میں رائج تقریباً سبھی علوم میں سو سے زاید کتابیں تحریر فرمائی ہیں۔ جن کی موضوعاتی فہرست قارئین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے:

الف:- تفسیر

ا۔ الحاشیہ علی تفسیر البیضاوی	عربی
۲۔ تفسیر بیضاوی پر ایک اور حاشیہ	عربی
۳۔ انس التوحید فی تفسیر آیۃ العدل والتوحید۔	عربی
۴۔ تفسیر آیۃ انما المشرکون نجس	عربی

۵۔ تفسیر آیۃ الرؤیا — عربی
۶۔ تفسیر آیہ فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ لاسلام — عربی
۷۔ کشف العوار فی تفسیر آیۃ الغار
۸۔ تفسیر آیۃ تطہیر ورد کلام فخر رازی
۹۔ تفسیر آیہ قال انّی اری سبع بقرات — عربی
۱۰۔ رسالہ السحاب المطیر فی تفسیر آیۃ التطھیر — عربی

ب:۔حدیث، شرح حدیث، دعائیں:

۱۔ ادعیہ ماثورہ
۲۔ شرح دعاء صباح منقول از حضرت امیر المومنینؑ (فارسی) آپ نے یہ شرح ۹۹۰ھ میں خیرات بیگم نامی ایک شہزادی کے لئے لکھی ہے۔
۳۔ شرح مشکوٰۃ المصابیح
۴۔ النظر السلیم۔ سنّی عالم محیی الدین البغوی کی کتاب مقدمۃ المصابیح کی شرح۔
۵۔ رسالہ در فضیلت عید بابا شجاع

ج:۔ علم کلام

۱۔ احقاق الحق۔ اس کتاب کے متعلق صاحب کشف الحجب لکھتے ہیں:

نقض فیه البطال الذی الفه ابن روز بهان زاعما انه جواب نهج الحق ونهج الصدق لآیة الله فی العالمین العالمة الحلّی اس کتاب میں شہید ثالث نے ابن روز بہان کی کتاب "ابطال الباطل" کا جواب دیا ہے جسے ابن روز بہا علامہ حلّی کی کتاب "نہج الحق و نہج الصدق" کا جواب سمجھتے تھے۔ یہ کتاب شہید نے عربی زبان میں ۱۰۱۴ھ میں آگرہ میں تالیف فرمائی۔ کہا جاتا ہے کہ یہی کتاب آپ کی شہادت کا باعث ہوئی ہے۔

۲۔ "مصائب النواصب" اس کتاب کے متعلق صاحب کشف الحجب لکھتے ہیں نقض فی ھذا الکتاب نواقض الروافض نقضاً جید أورتبه علی مقدمات جیاد وو جیود شد اداولہ نحمد ک یا من جعلنا من الفرقۃ الناجیۃ الامامیۃ

الاثناعشریہ" شہید ثالث نے اس کتاب "نواقض الروافض کا بہترین جواب دیا ہے۔ اس کتاب میں آپ نے چند عمدہ مقدمات ترتیب دیئے ہیں اس کے شروع میں ہے کہ اے ہم تیری حمد و ثنا کرتے ہیں اے وہ ذات جس نے ہمیں نجات پانے والے فرقہ امامیہ اثناعشریہ میں قرار دیا ہے۔ یہ کتاب عربی میں ہے۔

۳۔ صوارم مہرقہ فی دفع الصواعق المحرقہ۔ عربی۔

۴۔ شرح اثبات واجب جدید۔ عربی۔

۵۔ شرح اثبات واجب قدیم۔ عربی۔

۶۔ حاشیہ بر بحث عذاب قبر از شرح عقاید نسفی۔ عربی۔

۷۔ رسالہ نور العین۔

۸۔ رسالہ الذکر الابقی۔ عربی۔

۹۔ حاشیہ بر رسالہ اجوبہ فاخرہ۔ عربی۔

۱۰۔ رسالہ حقیقت عصمت کے بارے میں۔ عربی۔

۱۱۔ رسالی فی جواب شہاب الشیطان۔

۱۲۔ رسالہ الموذج معروف بہ جلالیہ۔ عربی۔

۱۳۔ حاشیہ بر مبحث امامت شرح تجرید۔ عربی۔

۱۴۔ حاشیہ بر معاد شرح۔ عربی۔

۱۵۔ شرح مبحث حدوث عالم از الموذج دوانی۔ عربی۔

۱۶۔ رسالہ تصحیح ایمان فرعون کے جواب میں۔ عربی۔

۱۷۔ رسالہ فی رد ما کتب بعضھم فی نفی عصمة الانبیاء۔ عربی۔

۱۸۔ رسالہ میر یوسف علی حسینی اخباری کے سوالات کے جواب میں۔ عربی۔

۱۹۔ رسالہ النور الانوار والنور الازھر فی تنویر خفاء یا رسالہ القضاء والقدر۔ عربی۔

یہ رسالہ، علامہ حلی کے رسالہ، استقصاء النظر فی بحث القضاء والقدر پر بعض مخالفوں کے اعتراضات کے جواب میں ہے۔ یہ رسالہ شہید ثالث نے جمادی الثانی ۱۰۱۸ھ میں مکمل کیا ہے۔

۲۰۔رسالہ دافعة الشقاق کتاب کشف الحجب میں اس کتاب کا نام دافعة النفاق ہے۔

۲۱۔ نہایۃ الاقدام۔

۲۲۔رسالہ۔ صواعق محرقہ کے ترجمہ کے مقدمات کے جواب میں۔

۲۳۔رسالہ فی ردرسالة الکاشی۔

۲۴۔رسالہ فی رد شبهة فی تحقیق العلم الالٰهی۔

۲۵۔رسالہ خیرات حسان۔

۲۶۔رسالہ فی بیان وجوب اللطف ، معروف بہ الطرائف۔

۲۷۔حاشیہ شرح مواقف۔

۲۸۔ بحر الغدیر در اثبات حدیث تواتر۔ غدیر۔

۲۹۔حاشیہ تبصرة العوام پر۔

۳۰۔رسالہ رفع القدر۔یادفع القدر۔	عربی۔
۳۱۔رسالۃ العقال۔	عربی۔
۳۲۔ تحفۃ العقول۔	عربی۔
۳۳۔ موائد الانعام۔	عربی۔
۳۴۔العشرة الکاملۃ۔	عربی۔
۳۵۔رسالہ لطیفہ یالطیفہ۔	عربی۔
۳۶۔رسالہ جلالیہ۔	عربی۔
۳۷۔اجوبۃ مسائل سید حسن عزنوی۔	عربی۔

ز:۔فقہ واصول فقہ:

ا۔ تہذیب الاحکام فی شرح تہذیب الاحکام۔یہ کتاب شہید نے شوشتر میں ۸ جلدوں میں لکھی ہے۔

۲۔حاشیہ شرح تہذیب الاصول۔ عربی۔

۳۔حاشیہ۔علامہ حلّی کی کتاب قواعد الاحکام کے باب شہادت پر۔ عربی۔

۴۔حاشیہ مختلف الشیعہ۔ عربی۔

۵۔حاشیہ۔شرح مختصر الصول۔ عربی۔

۶۔رسالة لمعة فی صلوٰة الجمعة ۔ عربی۔

۷۔رسالہ فی نجاسة الخمر۔ عربی۔

۸۔رسالة فی رکنیة السجدتین۔ عربی۔

۹۔رسالہ فی غسل الجمعة ۔ عربی۔

۱۰۔رسالة فی مسئلة لبس الحریر۔ عربی۔

۱۱۔منتخب کتاب المحلی لابن جزم الاندلسی۔ عربی۔

۱۲۔رسالہ آب قلیل کی نجاست کے بارے میں۔ عربی۔

۱۳۔رسالة فی مسئلة الکفار۔ عربی۔

۱۴۔تعلیقات شرح مختصر الاصول للقاضی یحیٰ الشافعی۔عربی۔

۱۵۔رسالہ دراثبات مسح رجلین۔ عربی۔

۱۶۔رسالة فی تقدیر الماء الکثیر الذی حکم علیہ الشارع بالتطهیر۔عربی

۱۷۔حاشیہ شرح الوقایہ فقہ الحنیفیة ۔ عربی۔

۱۸۔ رسالة فی ردمالفہ تلمیذ ابن اهمام فی بیان اقتداء الحنفیة بالشافعیة۔عربی۔

۱۹۔غایة المرام۔ شرح تهذیب الاحکام۔ عربی۔

۲۰۔حاشیہ ھدایہ پر عربی۔

۲۱۔ رسالہ فی تجدید الوضوء عربی۔

ھ:۔منطق:

۱۔حاشیہ۔شرح شمسیہ قطبی پر۔ عربی۔

۲۔شرح بدیع المیزان۔ عربی۔

۳۔حاشیہ۔تہذیب ملاجلال کے حاشیہ پر۔ عربی۔

۴۔حاشیہ تہذیب المنطق کے حاشیہ جلالیہ پر۔ عربی۔

و:۔فلسفہ:

۱۔حاشیہ شرح ھدایہ پر۔ عربی۔

۲۔حاشیہ۔شرح تجرید کے حاشیہ قدیمہ پر۔

۳۔حاشیہ۔شرح تجرید اصفہانی پر چلپی کے جواب میں۔ عربی۔

۴۔حاشیہ۔شرح تجرید کی الٰہیات پر۔ عربی۔

۵۔شرح حاشیہ تشکیک۔ عربی۔

۶۔رسالہ۔انواع کم کے بیان میں۔ عربی۔

۷۔ رسالہ فی ان الوجود لامثال لہ۔ عربی۔

۸۔حاشیہ۔شرح تجرید کے مبحث اعراض پر۔ عربی۔

۹۔حاشیہ۔شرح تجرید کے مبحث جواہر۔ عربی۔

۱۰۔شرح مبحث جواہر۔ عربی۔

۱۱۔حاشیہ میبذی۔ عربی۔

ز:۔ریاضی:

۱۔حاشیہ۔شرح چغمنی پر۔ عربی۔

۲۔حاشیہ تحریر اقلیدس پر۔ عربی۔

۳۔رسالہ صد باب اسطر لاب۔اسی نام کی کتاب نور اللہ اول کی تالیف میں بھی ہے۔

۴۔حاشیہ علی خلاصۃ الحساب بہائی۔ عربی۔

ح:۔تاریخ ورجال:

۱۔مجالس المؤمنین۔ فارسی۔

۲۔رسالہ اثبات تشیع سید محمد نور بخش۔

۳۔حاشیۃ الرجال علامہ حلی۔ عربی۔

۴۔تراجم الرضائیین۔ عربی۔

ط:۔علم معانی وبیان:

۱۔حاشیہ بر مختصر المعانی۔ عربی۔

۲۔حاشیہ برمطول۔	عربی۔
۳۔حاشیہ شرح مختصر المعانی کے حاشیہ ختائی پر۔	عربی۔

ی:۔ادب:

۱۔دیوان قصائد۔	فارسی و عربی۔

۲۔شرح خطبة حاشیه القزوینی علی العضدی۔

۳۔ حاشیة علی خطبة شرح المواقف۔

۴۔شرح رباعیات شیخ ابوسعید ابوالخیر۔	فارسی۔
۵۔دیوان اشعار۔	فارسی۔
۶۔کتاب نشات۔	فارسی۔

۷۔شرح خطبة حاشیة علی مختصر ابن الحاجب فارسی۔

۸۔شرح گلشن راز شبستری۔

۹۔رسالہ گل و سنبل۔اسی نام کا رسالہ نور اللہ اول کے تالیفات میں بھی ہے۔

۱۰۔گوہر شاھوار۔

ک:صرف و نحو:

۱۔ رسالہ فی تعریف الماضی ومتعلقاتها۔

۲۔حاشیہ بر شرح جامی۔

۳۔حاشیہ برمطول۔

۴۔رسالہ مبحث تخدیر۔

ل:۔مختلف علوم:

۱۔رسالة عدة الابرار۔

۲۔رسالة عشرة کامله خانخانیه۔

۳۔رسالہ سبعه سیارہ۔

۴۔رسالہ فی بعض المشکلات۔

☆